ذوالقعدہ ۱۴۳۵ھ
ستمبر ۲۰۱۴ء

ماہنامہ

میثاق

لاہور

یکے از مطبوعات

تنظیمِ اسلامی

بانی: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

استعانت باللہ

"اربعینِ نوویؒ" کی ایک حدیث کی تفہیم

بانیٔ تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمدؒ

داعیٔ رجوع الی القرآن، بانیٔ تنظیم اسلامی

محترم ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

کے شہرۂ آفاق دورۂ ترجمہ قرآن پر مشتمل

بیانُ القرآن

ترجمہ و مختصر تفسیر

حصہ اول سُورۃ الفاتحہ وسُورۃ البقرۃ مع تعارفِ قرآن
(نواں ایڈیشن) ——— صفحات:360، قیمت475روپے

حصہ دوم سُورۃ آلِ عمران تا سُورۃ المائدہ
(چھٹا ایڈیشن) ——— صفحات321، قیمت425روپے

حصہ سوم سُورۃ الانعام تا سُورۃ التّوبہ
(پانچواں ایڈیشن) ——— صفحات331، قیمت425روپے

حصہ چہارم سُورۃ یُونس تا سُورۃ الکہف
(چوتھا ایڈیشن) ——— صفحات394، قیمت475روپے

حصہ پنجم سُورۃُ مَریَم تا سُورۃُ السَّجدۃ
(تیسرا ایڈیشن) ——— صفحات480، قیمت575روپے

حصہ ششم سُورۃُ الاحزاب تا سُورۃُ الحجرات
(پہلا ایڈیشن) ——— صفحات484، قیمت590روپے

ملنے کے پتے

انجمن خُدّام القرآن خیبر پختونخوا، پشاور
A-18 ناصر مینشن، ریلوے روڈ نمبر2، شعبہ بازار پشاور، فون: (091)2584824,2214495

مکتبہ خُدّام القرآن لاہور
K-36، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون 3-35869501(042)

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيثَاقَهُ الَّذِي وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ ۙ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۡ (المائدۃ:۷)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل اور اس کے میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے مانا اور اطاعت کی!

ماہنامہ میثاق لاہور

اجرائے ثانی

ڈاکٹر اسرار احمدؒ

جلد : 63

شمارہ : 9

ذوالقعدہ 1435ھ

ستمبر 2014ء

فی شمارہ 25/-

مدیر
حافظ عاکف سعید

نائب مدیر
حافظ خالد محمود خضر

سالانہ زرِتعاون

اندرون ملک	250 روپے
بھارت و بنگلہ دیش	900 روپے
ایشیا، یورپ، افریقہ وغیرہ	1200 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا وغیرہ	1500 روپے

ترسیل زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مکتبہ خدام القرآن لاہور

مقام اشاعت: 36۔ کے ماڈل ٹاؤن لاہور 54700 ' فون: 3-35869501

فیکس: 35834000' ای میل: maktaba@tanzeem.org

ای میل برائے ادارتی امور: publications@tanzeem.org

ویب سائٹ ایڈریس: www.tanzeem.org

مرکزی دفتر تنظیم اسلامی: 67۔ علامہ اقبال روڈ' گڑھی شاہو لاہور

فون: 36366638 - 36316638 فیکس: 36313131

پبلشر: ناظم مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

طابع: رشید احمد چوہدری مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مشمولات

- **عرضِ احوال** — 5
  - اب ہم کہاں کھڑے ہیں؟ — ایوب بیگ مرزا
- **بیانُ القُرآن** — 9
  - سورۃ الکھف (آیات ۱ تا ۱۴) — ڈاکٹر اسرار احمدؒ
- **تفہیم القرآن** — 28
  - تصورِ توحید کی نعمت — سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ
- **مطالعۂ حدیث** — 31
  - استعانت باللہ (صرف اللہ سے مدد مانگنا) — ڈاکٹر اسرار احمدؒ
- **منتخب نصاب ۲** — 52
  - حزب اللہ بمقابلہ حزب الشیطان — انجینئر نوید احمد
- **تعمیرِ سیرت** — 71
  - ثروت مندی اور ناداری کی حقیقت — پروفیسر محمد یونس جنجوعہ
- **تذکیر وموعظت** — 79
  - احوالِ موت — محمد سہیل
- **حسنِ معاشرت** — 85
  - دعوتِ ولیمہ: ایک جائزہ — حافظ محمد زاہد
- **بحث ونظر** — 90
  - ذوالقرنین، سدِّ ذوالقرنین اور یاجوج ماجوج — شاہین عطر جنجوعہ

❁ ❁ ❁

بسم اللّٰہ الرّحمٰن الرّحیم

پاکستان کی سیاسی تاریخ پر ایک نظر

اب ہم کہاں کھڑے ہیں؟

پاکستان کے موجودہ سیاسی بحران کو سمجھنے کے لیے پاکستان کی سڑسٹھ (۶۷) سالہ سیاسی تاریخ کا جائزہ لینا ہوگا۔ پاکستان کے پہلے گورنر جنرل قائداعظم محمد علی جناح اور وزیراعظم لیاقت علی خان بنے۔ قائداعظم پاکستان بننے کے بعد تیرہ ماہ تک زندہ رہے لیکن یہ وقت بھی انہوں نے بیماری کی حالت میں گزارا' لہٰذا وہ اہلِ پاکستان کی نظریاتی اور فکری رہنمائی تو کرتے رہے' لیکن عملی طور پر حکومتی معاملات لیاقت علی خان ہی چلاتے رہے۔ آئین کی عدم موجودگی کی وجہ سے گورنر جنرل اور وزیراعظم میں اختیارات کی کوئی واضح تقسیم سامنے نہیں تھی۔ قائداعظم کی وفات پر خواجہ ناظم الدین گورنر جنرل بنے۔ خواجہ ناظم الدین ایک شریف النّفس انسان تھے اور دھیمی طبیعت کے مالک تھے اور لیاقت علی خان کی شخصیت تحریک پاکستان کے حوالے سے بڑی نمایاں تھی۔ لہٰذا ۱۶/اکتوبر ۱۹۵۶ء یعنی لیاقت علی خان کی شہادت تک گورنر جنرل اور وزیراعظم میں اختیارات کے حوالہ سے کوئی تصادم سامنے نہ آیا۔

۱۹۳۵ء کے ایکٹ کے تحت روزمرہ کے معاملات کو چلایا جارہا تھا۔ وزیراعظم تمام حکومتی امور کا انچارج تھا' لیکن کیا گورنر جنرل وزیراعظم کے باس کی حیثیت رکھتا تھا؟ یہ بات مبہم تھی۔ لیاقت علی خان کی شہادت کے بعد سازشوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ غلامی کے دور کی تیار کردہ بیوروکریسی نے اقتدار پر اپنے مضبوط پنجے گاڑنے کے لیے چالبازی سے کام لینا شروع کیا۔ خواجہ ناظم الدین سے کہا گیا کہ حکومتی امور کی ذمہ داری تو وزیراعظم کی ہے' آپ وزیراعظم بن جائیں۔ لہٰذا انہیں گورنر جنرل کی بجائے وزیراعظم کا عہدہ دے دیا گیا اور ملک غلام محمد جو ایک بیوروکریٹ تھا اس نے گورنر جنرل کے عہدہ پر قبضہ کرلیا۔ ملک غلام محمد نے اقتدار کی تقسیم کے حوالہ سے موجود ابہام کا خوب فائدہ اٹھایا۔ پہلے وزیراعظم کو برطرف کیا اور پھر اسمبلی کو چلتا کیا۔ یہ لڑائی جھگڑا آئین کی تشکیل میں بھی رکاوٹ بنا رہا۔ بالآخر ۱۹۵۶ء میں آئین تشکیل پا گیا۔ گورنر جنرل کا عہدہ ختم کردیا گیا۔ وزیراعظم کو سربراہِ حکومت اور صدر کو سربراہِ مملکت کی حیثیت دی گئی۔ آئین کی تشکیل کے باوجود اقتدار کی چھینا جھپٹی جاری رہی اور مارچ ۱۹۵۶ء سے اکتوبر ۱۹۵۸ء تک اڑھائی سال میں چودھری محمد علی' حسین شہید سہروردی'

آئی آئی چندریگر اور فیروز خان نون چار سیاست دان وزیراعظم بنائے اور ہٹا دیے گئے۔ اکتوبر ۱۹۵۸ء کو ایوب خان کا مارشل لاء نافذ ہوگیا۔ یہ مارشل لاء قریباً گیارہ سال تک رہا۔ ایک مدت تک سیاسی سطح پر بہت سکون رہا۔ پاکستان میں صنعتی ترقی کے شاندار ریکارڈ قائم ہوئے۔ یوں محسوس ہوا کہ پاکستان ترقی کے زینے تیزی سے طے کر کے ایک ترقی یافتہ ملک بننے جا رہا ہے۔ پھر کیا ہوا؟ ایوب خان کے خلاف تحریک چلی اور ایسی بے نظیر تحریک چلی کہ گولی اور کرفیو اس تحریک کو ختم نہ کر سکے۔ اور انجام کیا ہوا کہ نہ صرف ترقی معکوس نے ملک میں بدترین حالات پیدا کر دیئے' بلکہ ملک بھی دولخت ہوگیا اور ۱۹۵۸ء میں جب مارشل لاء نافذ ہوا تھا ملک اس سے بھی پیچھے چلا گیا۔

۱۹۷۲ء سے ۱۹۷۷ء تک سیاسی حکومت رہی۔ پھر ذوالفقار علی بھٹو کے خلاف قومی و مذہبی جماعتوں کا ایک اتحاد قائم ہوا' جس کی تحریک کے نتیجہ میں ضیاء الحق کا مارشل لاء آدھمکا۔ یہ مارشل لاء بھی قریباً گیارہ سال جاری رہا۔ ایک بار پھر اہلِ پاکستان کو محسوس ہوا کہ ملک میں امن و ترقی کا دور شروع ہوگیا ہے۔ لیکن آج کہنے والے کہتے ہیں کہ آج پاکستان جن مصائب اور مسائل سے دوچار ہے یہ صرف اور صرف ضیاء الحق کے مارشل لاء کا نتیجہ ہے۔ یہ بات کس حد تک صحیح ہے' ہم کچھ کہنے کی پوزیشن میں نہیں' لیکن یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ ضیاء الحق کی اسلام کی طرف نیم دلانہ اور ایسا اسلام نافذ کرنے کی کوششیں جو ان کے اقتدار کے لیے خطرہ نہ بنیں انتہائی ضرر رساں ثابت ہوئیں۔ ان کے اس طرزِ عمل نے یہ غلط تاثر دیا کہ اسلامی نظام بھی پاکستان کے مسائل کا حل نہیں ہے۔ حالانکہ اسلام کا نام لے کر جو اقدامات ضیاء الحق نے کیے' حقیقی اسلامی نظام سے اس کا دُور کا تعلق بھی نہ تھا۔ زانیوں اور شرابیوں کی بجائے سیاسی اور صحافتی مخالفین کو کوڑے مارے گئے' جس سے اندرون اور بیرون ملک لوگوں کو اسلام کے حوالہ سے غلط پیغام گیا۔ پاکستان پیپلز پارٹی کے ساتھ جو زیادتیاں ہوئیں ان کا ردعمل یہ ہوا کہ انہیں عوامی ہمدردیاں حاصل ہوگئیں۔ صدر ضیاء الحق کے طیارے کو حادثہ پیش آیا تو ۱۹۸۸ء کے انتخابات میں پیپلز پارٹی کامیاب ہوگئی۔ گویا پاکستان پھر ۱۹۷۰ء والے مقام پر آ پہنچا۔ ایک بار پھر آئی جے آئی کے نام سے پاکستان پیپلز پارٹی کے خلاف اسلامی جماعتوں کا ایک اتحاد بنا۔ ۱۹۸۸ء سے ۱۹۹۹ء تک گیارہ سال نواز شریف اور بے نظیر کی سیاسی حکومتیں قائم ہوئیں اور دونوں ایک دوسرے کی ٹانگیں کھینچتے رہے۔ ۱۲/اکتوبر ۱۹۹۹ء کو جنرل پرویز مشرف نے مارشل لاء نافذ کر دیا اور پاکستان ۱۹۵۸ء والے مقام پر پھر آ کھڑا ہوا۔ پرویز مشرف نے ظاہری طور پر اچھا آغاز کیا۔ نائن الیون نے اسے امریکہ کی مدد سے ملک میں اپنے اقتدار کو مضبوط کرنے کا موقع مہیا کر دیا۔ ملکی معیشت ایک بار پھر مضبوط ہونا شروع ہوئی۔ ۲۰۰۶ء میں پرویز مشرف کی چیف جسٹس آف پاکستان افتخار چودھری سے رسّہ کشی شروع ہوئی جس نے حکومت کی بنیادیں ہلا ڈالیں۔ پرویز مشرف نے ۲۰۰۸ء

میں الیکشن کروائے‘ بلکہ سلیکشن کی اور پاکستان پیپلز پارٹی ایک بار پھر برسر اقتدار آ گئی‘ کیونکہ نواز شریف پرویز مشرف کو وارہ نہیں کھاتے تھے۔ پرویز مشرف کے دور میں نواز شریف اور بے نظیر متحد ہو چکے تھے۔ انہوں نے لندن میں چارٹر آف ڈیموکریسی پر دستخط کیے‘ جس کی روح یہ تھی کہ ہم آئندہ ایک دوسرے سے لڑنے کی بجائے اقتدار کے لیے باریاں مقرر کر لیں گے‘ جب ایک باری لے رہا ہوگا تو دوسرا فرینڈلی اپوزیشن کر کے اس کی حکومت کو تقویت پہنچائے گا۔ ۲۰۰۸ء کے انتخابات کے بعد پی پی پی نے پرویز مشرف کو چلتا کیا۔ ۲۰۰۸ء سے ۲۰۱۳ء تک لندن معاہدے پر پوری طرح عمل درآمد ہوا۔ آصف زرداری اور اس کے حواریوں نے ملک کو خوب لوٹا لیکن نواز شریف فرینڈلی اپوزیشن کرتے رہے۔ ان کے اس مک مکا نے ایک تیسرا لیڈر پیدا کر دیا تھا جسے عمران خان کہتے ہیں۔

۲۰۱۳ء میں انتخابات ہوئے۔ طے شدہ پروگرام کے مطابق باری نواز شریف کی تھی۔ پنجاب میں نواز شریف‘ سندھ میں پی پی پی اور کراچی میں ایم کیو ایم نے دھاندلی کی۔ پنجاب کے نتائج نے نواز شریف کو وزیراعظم بنا دیا۔ پاکستان پیپلز پارٹی نے ہلکی آواز میں اس دھاندلی کا ذکر کیا اور وعدے کے مطابق فرینڈلی اپوزیشن کا رول ادا کرنا شروع کر دیا‘ لیکن تحریک انصاف جوان انتخابات میں دوسری بڑی پارٹی بن کر ابھری تھی اس کے سربراہ نے شور مچایا اور خوب مچایا۔ اور اب وہ اسلام آباد کے ریڈ زون میں دن رات ڈیرے جمائے ہوئے ہیں اور ان کا مطالبہ ہے کہ نواز شریف کا مینڈیٹ جعلی ہے وہ استعفا دیں‘ دھاندلی کی تحقیقات کرائی جائیں‘ اگر دھاندلی ثابت ہو جائے تو نئے انتخابات کروائے جائیں۔

ہم نے پاکستان کی سڑسٹھ (۶۷) سالہ سیاسی تاریخ کو چند سطور میں لکھنے کی کوشش کی ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ہمارے قارئین کی اکثریت اس سے واقف ہوگی‘ ہم نے اس کا اعادہ اس لیے کیا ہے کہ اس بات کو سمجھا جائے کہ ہمارے ہاں جو گندا سیاسی کھیل جاری ہے جس سے جمہوری دنیا میں ہمارا مذاق بنا ہوا ہے اور جس کی وجہ سے ہماری معیشت سانپ اور سیڑھی کا کھیل کھیلتی رہی ہے‘ وہ قارئین کے ذہن میں تازہ ہو جائے اور یہ سمجھنے کی کوشش کی جائے کہ اس کی وجہ کیا ہے؟ ایسا کیوں ہے؟ اگر ہم جمہوری ملک ہونے کے دعوے دار ہیں تو باقی جمہوری ممالک سے ہم مختلف کیوں ہیں؟ وہاں یہ سب کچھ کیوں نہیں ہوتا؟ حقیقت یہ ہے کہ تمہید کے مقابلے میں اصل موضوع بہت ہی چھوٹا اور مختصر ہے۔

درحقیقت قیامِ پاکستان کے بعد ہم نے قومی سطح پر یہ سمجھا کہ اصل مقصد انگریز کی غلامی سے آزادی حاصل کرنا تھی جو ہم کر چکے‘ اب ہمیں اس آزادی کے ثمرات کو سمیٹنا ہے۔ اس سوچ نے لالچ اور ہوس‘ جو انسان کی جبلت میں ہوتی ہے‘ کو مہمیز دی۔ مہاجرین کی آبادکاری کا مسئلہ حل کرتے کرتے ہم ہندوؤں کی چھوڑی ہوئی پراپرٹی کی لوٹ مار میں مصروف ہو گئے۔ یہیں سے بددیانتی کا آغاز ہوا۔ جو لوگ اقتدار پر قابض ہوئے انہوں نے اقتدار کو دولت حاصل کرنے کا ذریعہ بنایا۔ بات آگے

بڑھتی گئی۔ اب صورت حال یہ ہو گئی کہ دولت خرچ کر کے اقتدار حاصل کیا جاتا اور اقتدار حاصل کر کے دولت کو دگنا چگنا کیا جاتا رہا۔ نمود و نمائش نے حرص و ہوا کو اور بڑھایا‘ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ دیانت اور اخلاقیات کا جنازہ اٹھ گیا۔ دولت سٹیٹس سمبل بن گئی‘ اس سے کوئی غرض نہیں کہ یہ کیسے حاصل کی گئی۔ حرام اور حلال کی تمیز اُٹھ گئی۔ یہاں تک کہ حلال کمانے والے اور کھانے والوں کو احمق سمجھا جانے لگا‘ ان کا استہزاء کیا جاتا۔ سرکاری دفاتر میں جائز کام کروانے کے لیے بھی بڑے پاپڑ پیلنے پڑتے ہیں‘ لہٰذا جائز کام کے لیے بھی ناجائز ذرائع اختیار کرنا ناگزیر ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ کی سنّت یہ ہے کہ جس راہ میں کوشش اور جدّوجہد کرو گے وہی راستے تمہارے لیے کھولتا چلا جائے گا۔ اگر کوئی شخص یا گروہ یا قوم اللہ کی طرف رجوع کرے گی‘ آخرت کی خواہش مند ہوگی تو اسے اس حوالہ سے کامیابی ہوگی۔ اگر کوئی اپنی قوم ملک اور سلطنت کے لیے دن رات جدوجہد کرے گا تو اسے اس حوالہ سے اس کی محنت کا ثمر دنیا میں ہی مل جائے گا اور دنیا کے سامنے ایک مضبوط و مستحکم قوم و ملک بن کر سامنے آئیں گے‘ اور اگر آپ اپنی ذات کے لیے محنت کرتے ہوئے قوم و ملک اور آخرت کو تج دیتے ہیں تو آپ اپنی ذات میں ترقی کریں گے‘ قوم و ملک بھی کمزور ہوں گے‘ اور آخرت بھی تباہ ہوگی۔

آیئے ہم خود کو اس کسوٹی پر پرکھیں۔ کیا یہ درست نہیں کہ ہم نے ذاتی سطح پر بہت ترقی کی ہے‘ لیکن ہمارا ملک پاکستان تباہی کے دہانے پر پہنچا ہے اور اللہ کو بھی ہم نے ناراض کیا ہوا ہے‘ لہٰذا ہم پر مختلف عذاب بھی نازل ہو رہے ہیں۔ ہم نے اپنی خوش قسمتی کو بُری طرح بدقسمتی میں تبدیل کر لیا۔ ہم نے اسلامی نظریہ کی بنیاد اور اس نعرہ پر ملک حاصل کیا۔ اگر ہم اس سے منحرف نہ ہوتے‘ اگر ہم اس نظریہ کو پاکستان میں عملی تعبیر دیتے تو ہماری خوش قسمتی یہ تھی کہ جو محنت اور جہاد ہم آخرت کی کامیابی کے لیے کرتے ہیں وہ یقیناً اور لازماً ہمیں دنیا میں بھی پھل دیتا۔ یہاں کی مختلف قومیتیں اسلام کے نام پر ایک قوم بنی تھیں‘ اگر ہم اپنے دین کے ساتھ چمٹ جاتے تو پاکستان کے کونے کونے کے لوگ بھی ایک دوسرے سے چمٹے رہتے‘ یہاں کبھی بنگالی‘ سندھی اور پنجابی یا پٹھان کی آواز نہ اٹھتی۔ دینی بھائی چارہ ہمیں ایک لڑی میں پرو دیتا۔ جب توجہ دین اور آخرت کی طرف مبذول ہوتی تو اس متاعِ دنیا کی کوئی حیثیت نہ رہتی‘ لوٹ کھسوٹ کا کوئی سوال نہ اٹھتا۔ اقتدار ایک ذمہ داری اور بوجھ سمجھا جاتا۔ لہٰذا ہمیں پورا یقین ہے کہ اقتدار زرداری سے نواز شریف کو چلا جائے یا عمران خان اُچک کر لے جائیں پاکستان اور اہلِ پاکستان کے لیے حالات کسی صورت بہتر نہیں ہو سکتے‘ جب تک ہم یوٹرن نہیں لے لیتے‘ جب تک ہم انفرادی سطح پر مسلمان نہ ہو جائیں‘ جب تک معاشرہ مسلمان نہ ہو جائے! اور جب تک یہ ریاست اسلامی فلاحی ریاست نہ بن جائے تباہی رکتی دکھائی نہیں دیتی۔ یہ نوشتہ دیوار ہے‘ اللہ تعالیٰ ہمیں ہدایت دے اور ہمارا رخ صراطِ مستقیم کی طرف موڑ دے۔ آمین یاربّ العالمین! ۞۞

دورۂ ترجمۂ قرآن

ڈاکٹر اسرار احمد

سُورۃُ الکَھف

تمہیدی کلمات

سورۃ الکہف اور سورۂ بنی اسرائیل کا آپس میں جوڑے اور زوجیت کا تعلق ہے۔ دونوں سورتوں کے بارہ بارہ رکوع ہیں اور آیات کی تعداد بھی تقریباً برابر ہے۔ دونوں کے عین وسط میں حضرت آدمؑ اور ابلیس کا واقعہ بیان ہوا ہے اور اس ضمن میں اس حد تک مشابہت ہے کہ نہ صرف دونوں سورتوں کے ساتویں رکوع کا آغاز اس واقعہ سے ہوتا ہے بلکہ دونوں جگہوں پر واقعہ کی ابتدا بھی ایک ہی آیت سے ہو رہی ہے۔ ان کی نسبت زوجیت سے متعلق اہم نکات کا ذکر سورۂ بنی اسرائیل کے آغاز میں بھی ہو چکا ہے' جبکہ میری کتاب ''قرآن حکیم کی سورتوں کے مضامین کا اجمالی تجزیہ'' میں اس مضمون کو مزید جامعیت کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ سورۂ بنی اسرائیل کی آخری آیت اور سورۃ الکہف کی ابتدائی آیت میں ایک خاص ربط و تعلق ہے' جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ دونوں سورتیں ایک ساتھ قرآن میں وارد ہوئی ہیں اور ریل کے ڈبوں کی طرح باہم interlocked ہیں۔ سورۂ بنی اسرائیل کی آخری آیت کا آغاز ﴿وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ.....﴾ کے الفاظ سے ہو رہا ہے' یعنی اس میں اللہ تعالیٰ کی حمد کا حکم دیا جا رہا ہے' جبکہ سورۃ الکہف کا آغاز ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ.....﴾ کے الفاظ سے ہو رہا ہے۔ گویا یہاں اس حکم کی تعمیل ہو رہی ہے۔

آیات ۱ تا ۸

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ عَلٰی عَبْدِهِ الْكِتٰبَ وَلَمْ یَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا ؕ﴿۱﴾ قَیِّمًا

لِّیُنْذِرَ بَاْسًا شَدِیْدًا مِّنْ لَّدُنْهُ وَیُبَشِّرَ الْمُؤْمِنِیْنَ الَّذِیْنَ یَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا حَسَنًا ۙ﴿۲﴾ مَّاكِثِیْنَ فِیْهِ اَبَدًا ۙ﴿۳﴾ وَّیُنْذِرَ الَّذِیْنَ قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا ۚ﴿۴﴾ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ وَّلَا لِاٰبَآىِٕهِمْ ؕ كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ ؕ اِنْ یَّقُوْلُوْنَ اِلَّا كَذِبًا ؕ﴿۵﴾ فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰٓی اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ یُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِیْثِ اَسَفًا ؕ﴿۶﴾ اِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَی الْاَرْضِ زِیْنَةً لَّهَا لِنَبْلُوَهُمْ اَیُّهُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ؕ﴿۷﴾ وَاِنَّا لَجٰعِلُوْنَ مَا عَلَیْهَا صَعِیْدًا جُرُزًا ؕ﴿۸﴾

آیت ۱ ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ عَلٰی عَبْدِهِ الْكِتٰبَ﴾ ''کُل حمد و ثنا اور کُل شکر اللہ ہی کے لیے ہے جس نے نازل کی اپنے بندے پر کتاب''

رسول اللہ ﷺ کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ جو تعلق اور نسبت ہے اسے یہاں لفظ ''عبد'' سے نمایاں فرمایا گیا ہے۔

﴿وَلَمْ یَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا ؕ﴿۱﴾﴾ ''اور اس میں اُس نے کوئی کجی نہیں رکھی۔''

آیت ۲ ﴿قَیِّمًا لِّیُنْذِرَ بَاْسًا شَدِیْدًا مِّنْ لَّدُنْهُ﴾ ''(یہ کتاب) بالکل سیدھی ہے' تاکہ وہ خبردار کرے ایک بہت بڑی آفت سے اُس کی طرف سے''

یعنی نبی اکرم ﷺ پر نزولِ قرآن کے مقاصد میں سے ایک مقصد یہ بھی ہے کہ آپؐ لوگوں کو ایک بہت بڑی آفت کے بارے میں خبردار کر دیں۔ یہاں لفظ بَاْسًا بہت اہم ہے۔ یہ لفظ واحد ہو تو اس کا مطلب جنگ ہوتا ہے اور جب بطور جمع آئے تو اس کے معنی سختی' مصیبت' بھوک' تکلیف وغیرہ کے ہوتے ہیں۔ جیسے سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۷۷ (آیت البر) میں یہ لفظ بطور واحد بھی آیا ہے اور بطور جمع بھی: ﴿وَالصّٰبِرِیْنَ فِی الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِیْنَ الْبَاْسِ ؕ﴾۔ چنانچہ وہاں دونوں صورتوں میں اس لفظ کے معنی مختلف ہیں: ''اَلْبَاْسَآءِ'' کے معنی فقر و تنگدستی اور مصائب و تکالیف کے ہیں جبکہ ''وَحِیْنَ الْبَاْسِ'' سے مراد جنگ کا وقت ہے۔

بہرحال آیت زیر نظر میں ''بَاْسًا شَدِیْدًا'' سے ایک بڑی آفت بھی مراد ہو سکتی ہے اور بہت شدید قسم کی جنگ بھی۔ آفت کے معنی میں اس لفظ کا اشارہ اس دجالی فتنہ کی طرف ہے جو قیامت سے پہلے ظاہر ہوگا۔ حدیث میں ہے کہ کوئی نبی اور رسول ایسا نہیں گزرا جس نے اپنی قوم کو دجال کے فتنے سے خبردار نہ کیا ہو' کیونکہ یہ فتنہ ایک مؤمن کے لیے سخت ترین امتحان

ہوگا اور پوری انسانی تاریخ میں اس فتنے سے بڑا کوئی فتنہ نہیں ہے۔

دوسری طرف اس لفظ (بَاْسًا شَدِیْدًا) کو اگر خاص طور پر جنگ کے معنی میں لیا جائے تو اس سے ''اَلْمَلْحَمَۃُ الْعُظْمٰی'' مراد ہے اور اس کا تعلق بھی فتنہ دجال ہی سے ہے۔ کتبِ احادیث (کتاب الفتن، کتاب آثار القیامۃ، کتاب الملاحم وغیرہ) میں اس خوفناک جنگ کا ذکر بہت تفصیل سے ملتا ہے۔ عیسائی روایات میں اس جنگ کو ''ہرمجدون'' (Armageddon) کا نام دیا گیا ہے۔ بہرحال حضرت مسیح علیہ السلام کے تشریف لانے اور ان کے ہاتھوں دجال کے قتل کے بعد اس فتنہ یا جنگ کا خاتمہ ہوگا۔

بہت سی احادیث میں ہمیں یہ وضاحت بھی ملتی ہے کہ دجالی فتنہ کے ساتھ سورۃ الکہف کی ایک خاص مناسبت ہے اور اس فتنہ کے اثرات سے محفوظ رہنے کے لیے اس سورۃ کے ساتھ ذہنی اور قلبی تعلق قائم کرنا بہت مفید ہے۔ اس مقصد کے لیے احادیث میں جمعہ کے روز سورۃ الکہف کی تلاوت کرنے کی تلقین فرمائی گئی ہے، اور اگر پوری سورت کی تلاوت نہ کی جا سکے تو کم از کم اس کی ابتدائی اور آخری آیات کی تلاوت کرنا بھی مفید بتایا گیا ہے۔

یہاں پر دجالی فتنہ کی حقیقت کے بارے میں کچھ وضاحت بھی ضروری ہے۔ ''دجل'' کے لفظی معنی دھوکہ اور فریب کے ہیں۔ اس مفہوم کے مطابق ''دجال'' ایسے شخص کو کہا جاتا ہے جو بہت بڑا دھوکے باز ہو، جس نے دوسروں کو دھوکا دینے کے لیے جھوٹ اور فریب کا لبادہ اوڑھ رکھا ہو۔ اس لیے نبوت کے جھوٹے دعوے داروں کو بھی دجال کہا گیا ہے۔ چنانچہ نبی اکرم ﷺ نے جن تیس دجالوں کی پیدائش کی خبر دی ہے ان سے جھوٹے نبی ہی مراد ہیں۔

دجالیت کے اس عمومی مفہوم کو مدنظر رکھا جائے تو آج کے دور میں مادہ پرستی بھی ایک بہت بڑا دجالی فتنہ ہے۔ آج لوگوں کے اذہان و قلوب، نظریات و افکار اور اخلاق و اقدار پر مادیت کا اس قدر غلبہ ہو گیا ہے کہ انسان اللہ کو بھول چکا ہے۔ آج وہ مسبب الاسباب کو بھول کر مادی اسباب پر توکل کرتا ہے۔ وہ قرآن کے اس فرمان کو یکسر فراموش کر چکا ہے کہ: ﴿وَمَا الْحَیٰوۃُ الدُّنْیَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ﴿۱۸۵﴾﴾ (آل عمران) یعنی دنیوی زندگی محض دھوکے کا سامان ہے، جبکہ اصل زندگی آخرت کی زندگی ہے۔ آخرت کی زندگی پر پڑے ہوئے دنیا اور اس کی مادیت کے پردے سے دھوکا کھا کر انسان نے دُنیوی زندگی ہی کو اصل سمجھ لیا ہے، لہٰذا اس کی تمام دوڑ دھوپ اسی زندگی کے لیے ہے۔ اسی زندگی کے مستقبل کو سنوارنے کی اس کو فکر ہے، اور

یوں وہ مادّہ پرستی کے دجالی فتنے میں گرفتار ہو چکا ہے۔

اس کے علاوہ دجال اور دجالی فتنے کا ایک خصوصی مفہوم بھی ہے۔ اس مفہوم میں اس سے مراد ایک مخصوص فتنہ ہے جو قربِ قیامت کے زمانے میں ایک خاص شخصیت کی وجہ سے ظہور پذیر ہوگا۔ اس بارے میں کتبِ احادیث میں بڑی تفصیلات موجود ہیں، لیکن بعض روایات میں کچھ پیچیدگیاں بھی ہیں اور تضادات بھی۔ ان کو سمجھنے کے لیے اعلیٰ علمی سطح پر غور و فکر کی ضرورت ہے، کیونکہ ظاہری طور پر نظر آنے والے تضادات میں مطابقت کے پہلوؤں کو تلاش کرنا اہلِ علم کا کام ہے۔ بہرحال یہاں ان تفاصیل کا ذکر اور ان پر تبصرہ کرنا ممکن نہیں۔ اس موضوع کے بارے میں یہاں صرف اس قدر جان لینا ہی کافی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے قربِ قیامت کے زمانے میں دجال کے ظاہر ہونے اور ایک بہت بڑا فتنہ اٹھانے کے بارے میں خبریں دی ہیں۔ جو حضرات اس حوالے سے تفصیلی معلومات چاہتے ہوں وہ مولانا مناظر احسن گیلانی کی کتاب ''تفسیر سورۃ الکہف'' کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔ اس موضوع پر ''دنیا کی حقیقت'' کے عنوان سے میری ایک تقریر کی ریکارڈنگ بھی دستیاب ہے، جس میں میں نے سورۃ الکہف کے مضامین کا خلاصہ بیان کیا ہے۔

﴿وَیُبَشِّرَ الْمُؤْمِنِیْنَ الَّذِیْنَ یَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَھُمْ اَجْرًا حَسَنًا ﴿۲﴾﴾

''اور (تاکہ) وہ بشارت دے اُن اہل ایمان کو جو نیک عمل کرتے ہوں کہ ان کے لیے ہوگا بہت اچھا بدلہ۔''

آیت ۳ ﴿مَّاکِثِیْنَ فِیْہِ اَبَدًا ﴿۳﴾﴾ ''وہ اس میں رہیں گے ہمیشہ ہمیش۔''

آیت ۴ ﴿وَّیُنْذِرَ الَّذِیْنَ قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰہُ وَلَدًا ﴿۴﴾﴾ ''اور خبردار کر دے اُن لوگوں کو جنہوں نے کہا کہ اللہ نے بیٹا بنایا ہے۔''

دورِ حاضر کی دجالیت کی اصل جڑ موجودہ مسیحیت ہے جس کی بنیاد تثلیث پر رکھی گئی ہے اور اب اسے مسیحیت کے بجائے Paulism کہنا زیادہ درست ہے۔ اس میں سب سے پہلے حضرت مسیح علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا قرار دیا گیا۔ پھر اس میں کفارے کا عقیدہ شامل کیا گیا کہ جو کوئی بھی حضرت مسیحؑ پر ایمان لائے گا اسے تمام گناہوں سے پیشگی معافی مل جائے گی۔ اس کے بعد شریعت کو ساقط کر کے اس سلسلے میں تمام اختیارات پوپ کو دے دیے گئے، کہ وہ جس چیز کو چاہے حلال قرار دے اور جس کو چاہے حرام۔ ان تحریفات کی وجہ سے یورپ میں عام لوگوں کو

لفظ ''مذہب'' سے ہی شدید نفرت ہوگئی۔ پھر جب ہسپانیہ میں مسلمانوں کے زیر اثر جدید علوم کو فروغ ملا تو فرانس، اٹلی، جرمنی وغیرہ کے بے شمار نوجوانوں نے قرطبہ، غرناطہ اور طلیطلہ کی یونیورسٹیوں میں داخلہ لیا۔ یہ نوجوان حصول تعلیم کے بعد جب اپنے اپنے ممالک میں واپس گئے تو یورپ میں ان کی نئی فکر کی وجہ سے اصلاحِ مذہب (Reformation) اور احیائے علوم (Renaissance) کی تحریکات شروع ہوئیں۔ ان کی وجہ سے یورپ کے عام لوگ جدید علوم کی طرف راغب تو ہوئے مگر معاشرے میں پہلے سے موجود مذہب مخالف جذبات کی وجہ سے مذہب دشمنی خود بخود اس تحریک میں شامل ہوگئی۔ نتیجتاً جدید علوم کے ساتھ مذہب سے بیزاری، روحانیت سے لاتعلقی، آخرت سے انکار اور خدا کے تصور سے بیگانگی جیسے خیالات بھی یورپی معاشرے میں مستقلاً جڑ پکڑ گئے، اور یہ سب کچھ عیسائیت میں کی جانے والی مذکورہ تحریفات کا ردِعمل تھا۔ آیت زیر نظر میں انہی لوگوں کی طرف اشارہ ہے جنہوں نے یہ عقیدہ ایجاد کیا تھا کہ مسیحؑ (نعوذ باللہ) اللہ کا بیٹا ہے۔

آیت ۵ ﴿مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ وَّلَا لِاٰبَآئِهِمْ ؕ﴾ ''انہیں اس کے بارے میں کچھ بھی علم نہیں اور نہ ہی ان کے آباء واَجداد کو تھا۔''

انہوں نے یہ جو عقیدہ ایجاد کیا ہے اس کی نہ تو ان کے پاس کوئی علمی سند ہے اور نہ ہی ان کے آباء واَجداد کے پاس تھی۔

﴿كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ ؕ﴾ ''بہت بڑی بات ہے جو ان کے مونہوں سے نکل رہی ہے۔''

یہ لوگ اللہ تعالیٰ سے اولاد منسوب کر کے اس کی شان میں بہت بڑی گستاخی کا ارتکاب کر رہے ہیں۔

﴿اِنْ يَّقُوْلُوْنَ اِلَّا كَذِبًا ۝۵﴾ ''وہ نہیں کہتے مگر سراسر جھوٹ۔''

آیت ۶ ﴿فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَسَفًا ۝۶﴾ ''تو (اے نبی ﷺ!) آپ شاید اپنے آپ کو غم سے ہلاک کر لیں گے ان کے پیچھے، اگر وہ ایمان نہ لائے اس بات (قرآن) پر۔''

تثلیث جیسے غلط عقائد کے جو بھیانک نتائج مستقبل میں نسل انسانی کے لیے متوقع تھے ان کے تصور اور اِدراک سے رسول اللہ ﷺ پر شدید دباؤ تھا۔ آپؐ خوب سمجھتے تھے کہ اگر یہ

لوگ قرآن پر ایمان نہ لائے اور اپنے موجودہ مذہب پر ہی قائم رہے تو ان کے غلط عقائد کے سبب دنیا میں دجالیت کا فتنہ جنم لے گا، جس کے اثرات نسل انسانی کے لیے تباہ کن ہوں گے۔ یہی غم تھا جو آپؐ کی جان کو گھلائے جا رہا تھا۔

آیت ۷ ﴿اِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْاَرْضِ زِيْنَةً لَّهَا﴾ ''یقیناً ہم نے بنا دیا ہے جو کچھ زمین پر ہے اسے اس کا بناؤ سنگھار''

یہاں یہ نکتہ ذہن نشین کر لیجیے کہ لفظ ''زینت'' اور دُنیوی آرائش وزیبائش کا موضوع اس سورت کے مضامین کا عمود ہے۔ یعنی دنیا کی رونق، چمک دمک اور زیب وزینت میں انسان اس قدر کھو جاتا ہے کہ آخرت کا اسے بالکل خیال ہی نہیں رہتا۔ دنیا کی یہ رنگینیاں امریکہ اور یورپ میں اس حد تک بڑھ چکی ہیں کہ انہیں دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے اور انسان اس سب کچھ سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ آج ہم امریکی اور یورپی اقوام کی علمی ترقی سے متاثر اور ان کے مادی اسباب و وسائل سے مرعوب ہیں۔ اپنی اسی مرعوبیت کے باعث ہم ان کی لادینی تہذیب وثقافت کے بھی دلدادہ ہیں اور ان کے طرزِ معاشرت کو اپنانے کے بھی درپے ہیں۔

﴿لِنَبْلُوَهُمْ اَيُّهُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ۝۷﴾ ''تاکہ انہیں ہم آزمائیں کہ ان میں کون بہتر ہے عمل میں۔''

دُنیا کے یہ ظاہری ٹھاٹھ باٹھ دراصل انسان کی آزمائش کے لیے پیدا کیے گئے ہیں۔ ایک طرف دنیا کی یہ سب دلچسپیاں اور رنگینیاں ہیں اور دوسری طرف اللہ اور اس کے احکام ہیں۔ انسان کے سامنے یہ دونوں راستے کھلے چھوڑ کر دراصل یہ دیکھنا مقصود ہے کہ وہ ان میں سے کس کا انتخاب کرتا ہے۔ دنیا کی رنگینیوں میں کھو جاتا ہے یا اپنے خالق ومالک کو پہچانتے ہوئے اس کے احکام کی تعمیل کو اپنی زندگی کا اصل مقصود سمجھتا ہے۔ اس سلسلے میں کسی شاعر کا یہ شعر اگرچہ شانِ باری تعالیٰ کے لائق تو نہیں مگر اس مضمون کی وضاحت کے لیے بہت خوب ہے: ؎

رُخِ روشن کے آگے شمع رکھ کر وہ یہ کہتے ہیں
اِدھر آتا ہے دیکھیں یا اُدھر پروانہ جاتا ہے!

اب جس پروانے (انسان) کو اس شمع کی ظاہری روشنی اور چمک اپنی طرف کھینچ لے گئی تو وہ ﴿فَقَدْ خَسِرَ خُسْرَانًا مُّبِيْنًا ۝۱۱۹﴾ (النساء) کے مصداق تباہ وبرباد ہو گیا اور جو اس کی ظاہری اور وقتی چکاچوند کو نظر انداز کر کے حسن ازلی اور اللہ کے جلال وکمال کی طرف متوجہ ہو گیا وہ حقیقی

کامیابی اور دائمی نعمتوں کا مستحق ٹھہرا۔

آیت ۸ ﴿وَاِنَّا لَجٰعِلُوْنَ مَا عَلَيْهَا صَعِيْدًا جُرُزًا ۝۸﴾ ’’اور یقیناً ہم بنا کر رکھ دیں گے جو کچھ اس (زمین) پر ہے اسے ایک چٹیل میدان۔‘‘

قیامت برپا ہونے کے بعد اس زمین کی تمام آرائش و زیبائش ختم کر کے اسے ایک صاف ہموار میدان میں تبدیل کر دیا جائے گا۔ نہ پہاڑ اور سمندر باقی رہیں گے اور نہ یہ حسین و دلکش عمارات۔ اس وقت زمین کی سطح ایک ایسے کھیت کا منظر پیش کر رہی ہوگی جس کی فصل کٹ چکی ہو اور اس میں صرف بچا کھچا سوکھا چُورا اِدھر اُدھر بکھرا پڑا ہو۔

آیات ۹ تا ۱۶

اَمْ حَسِبْتَ اَنَّ اَصْحٰبَ الْكَهْفِ وَالرَّقِيْمِ ۙ كَانُوْا مِنْ اٰيٰتِنَا عَجَبًا ۝۹ اِذْ اَوَى الْفِتْيَةُ اِلَى الْكَهْفِ فَقَالُوْا رَبَّنَآ اٰتِنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً وَّهَيِّئْ لَنَا مِنْ اَمْرِنَا رَشَدًا ۝۱۰ فَضَرَبْنَا عَلٰٓى اٰذَانِهِمْ فِي الْكَهْفِ سِنِيْنَ عَدَدًا ۝۱۱ ثُمَّ بَعَثْنٰهُمْ لِنَعْلَمَ اَيُّ الْحِزْبَيْنِ اَحْصٰى لِمَا لَبِثُوْٓا اَمَدًا ۝۱۲ نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ نَبَاَهُمْ بِالْحَقِّ ۭ اِنَّهُمْ فِتْيَةٌ اٰمَنُوْا بِرَبِّهِمْ وَزِدْنٰهُمْ هُدًى ۝۱۳ وَّرَبَطْنَا عَلٰي قُلُوْبِهِمْ اِذْ قَامُوْا فَقَالُوْا رَبُّنَا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَنْ نَّدْعُوَا مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلٰهًا لَّقَدْ قُلْنَآ اِذًا شَطَطًا ۝۱۴ هٰٓؤُلَاۗءِ قَوْمُنَا اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً ۭ لَوْلَا يَاْتُوْنَ عَلَيْهِمْ بِسُلْطٰنٍۢ بَيِّنٍ ۭ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَي اللّٰهِ كَذِبًا ۝۱۵ وَاِذِ اعْتَزَلْتُمُوْهُمْ وَمَا يَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ فَاْوٗٓا اِلَى الْكَهْفِ يَنْشُرْ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِّنْ رَّحْمَتِهٖ وَيُهَيِّئْ لَكُمْ مِّنْ اَمْرِكُمْ مِّرْفَقًا ۝۱۶

آیت ۹ ﴿اَمْ حَسِبْتَ اَنَّ اَصْحٰبَ الْكَهْفِ وَالرَّقِيْمِ كَانُوْا مِنْ اٰيٰتِنَا عَجَبًا ۝۹﴾ ’’کیا تم سمجھتے ہو کہ غار اور رقیم (تختی) والے اصحاب ہماری بہت عجیب نشانیوں میں سے تھے؟‘‘

اب اصحابِ کہف کے متعلق اس سوال کے جواب کا آغاز ہو رہا ہے جو یہود مدینہ نے قریش مکہ کے ذریعے حضور ﷺ سے پوچھا تھا۔ کہف کے معنی غار کے ہیں اور رقیم سے مراد وہ

تختی ہے جس پر اصحابِ کہف کے حالات لکھ کر اسے غار کے دہانے پر لگا دیا گیا تھا۔ اس نسبت سے انہیں اصحابِ کہف بھی کہا جاتا ہے اور اصحاب الرقیم بھی۔ مراد یہ ہے کہ تم لوگ شاید اصحابِ کہف کے واقعہ کو ایک بہت غیر معمولی واقعہ اور ہماری ایک بڑی عجیب نشانی سمجھتے ہو، مگر تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ ہماری تخلیق اور صناعی میں تو اس سے بھی بڑے بڑے عجائبات موجود ہیں۔

اس قصے کے بارے میں اب تک جو ٹھوس حقائق ہمارے سامنے آئے ہیں اُن کا خلاصہ یہ ہے: حضرت مسیح علیہ السلام کی فلسطین میں بعثت کے وقت بظاہر یہاں ایک یہودی بادشاہ کی حکمرانی تھی مگر اس بادشاہ کی حیثیت ایک کٹھ پتلی سے زیادہ نہ تھی اور عملی طور پر یہ پورا علاقہ رومن ایمپائر ہی کا حصہ تھا۔ رومی حکمران مذہباً بت پرست تھے جبکہ فلسطین کے مقامی باشندے اہل کتاب (یہودی) تھے۔ حضرت مسیح علیہ السلام کے رفع سماوی کا واقعہ ۳۰ اور ۳۳ عیسوی کے لگ بھگ پیش آیا۔ اس کے بعد یہودیوں کی ایک بغاوت کے جواب میں رومی جنرل ٹائیٹس نے ۷۰ عیسوی میں یروشلم پر حملہ کر کے اس شہر کو بالکل تباہ و برباد کر دیا، ہیکل سلیمانی مسمار کر دیا گیا، یہودیوں کا قتل عام ہوا اور جو یہودی قتل ہونے سے بچ گئے انہیں ملک بدر کر دیا گیا۔ مقامی عیسائیوں کو اگرچہ علاقے سے بے دخل تو نہ کیا گیا مگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پیروکار اور موحّد ہونے کی وجہ سے انہیں رومیوں کی طرف سے اکثر ظلم و ستم کا نشانہ بنایا جاتا رہا۔ اسی حوالے سے رومی بادشاہ دقیانوس (Decius) کے دربار میں چند راسخ العقیدہ موحّد نوجوانوں کی پیشی ہوئی۔ بادشاہ کی طرف سے ان نوجوانوں پر واضح کیا گیا کہ وہ اپنے عقائد کو چھوڑ کر بت پرستی اختیار کر لیں ورنہ انہیں سولی پر چڑھا دیا جائے گا۔ بادشاہ کی طرف سے انہیں اس فیصلے کے لیے مناسب مہلت دی گئی۔ اسی مہلت کے دوران انہوں نے شہر سے نکل کر کسی غار میں پناہ لینے کا فیصلہ کیا۔ جب یہ لوگ غار میں پناہ گزیں ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت سے ان پر ایسی نیند طاری کر دی کہ وہ تقریباً تین سو سال تک سوتے رہے۔ (سورۃ البقرۃ آیت ۲۵۹ میں بھی اسی نوعیت کے ایک واقعہ کا ذکر ہے کہ حضرت عزیر علیہ السلام کو ان کی موت کے سو سال بعد زندہ کر دیا گیا) اور ان کی نیند کے دوران ان کی کروٹیں بدلنے کا بھی باقاعدہ اہتمام رہا۔ جس غار میں اصحابِ کہف سو رہے تھے وہ ایسی جگہ پر واقع تھی جہاں لوگوں کا آنا جانا بالکل نہیں تھا۔ اس غار کا دہانہ شمال کی جانب تھا جس کی وجہ سے اس کے اندر روشنی منعکس ہو کر تو آتی تھی، لیکن براہِ راست روشنی یا دھوپ نہیں آتی تھی۔ اس طرح کے غاروں کا ایک سلسلہ افسس شہر (موجودہ ترکی) کے علاقے میں پایا جاتا ہے جبکہ ہندوستان (ایبجنٹا) میں بھی ایسے غار موجود ہیں۔

بعدازاں قسطنطین (Constantine) نامی فرمانروا نے عیسائیت قبول کر لی اور اس کی وجہ سے پوری رومن ایمپائر بھی عیسائی ہوگئی۔ پھر ۴۰۰ عیسوی کے لگ بھگ Theodosius کے عہد حکومت میں اللہ تعالیٰ نے اصحاب کہف کو جگایا۔ جاگنے کے بعد انہوں نے اپنے ایک ساتھی کو چاندی کا ایک سکّہ دے کر کھانا لینے کے لیے شہر بھیجا اور ساتھ ہدایت کی کہ وہ محتاط رہے‘ ایسا نہ ہو ان کے غار میں چھپنے کی خبر بادشاہ تک پہنچ جائے۔ (وہ اپنی نیند کو معمول کی نیند سمجھ رہے تھے اور ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ تین سو سال تک سوئے رہے تھے۔) بہرحال کھانا لانے کے لیے جانے والا ان کا ساتھی اپنی تین سو سال پرانی وضع قطع اور کرنسی کی وجہ سے پکڑا گیا اور یوں ان کے بارے میں تمام معلومات لوگوں تک پہنچ گئیں۔ جب لوگوں کو حقیقت حال کا علم ہوا تو ہم مذہب ہونے کی وجہ سے عیسائی آبادی کی طرف سے ان کی بہت عزت افزائی کی گئی۔ اس کے بعد وہ لوگ غار میں پھر سے سو گئے یا اللہ تعالیٰ نے ان پر موت طاری کر دی۔ ان لوگوں کی طبعی موت کے بعد غار کے دہانے کو بند کر دیا گیا اور ایک تختی پر ان لوگوں کا احوال لکھ کر اسے اس جگہ پر نصب کر دیا گیا۔ اصحابِ کہف کا یہ قصہ گبن کی کتاب The Decline and fall of Roman Empire میں بھی Seven Sleepers کے عنوان سے موجود ہے۔ اس قصے کا ذکر چونکہ رومن لٹریچر میں تھا اور یہودی اِن تمام تفصیلات سے آگاہ تھے‘ اس لیے انہوں نے یہ سوال حضور ﷺ سے امتحاناً پوچھ بھیجا تھا۔

آیت ۱۰ ﴿اِذْ اَوَی الْفِتْیَةُ اِلَی الْکَهْفِ فَقَالُوْا رَبَّنَآ اٰتِنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً وَّهَیِّئْ لَنَا مِنْ اَمْرِنَا رَشَدًا ۝۱۰﴾ ’’جبکہ ان نوجوانوں نے غار میں پناہ لی اور انہوں نے کہا: اے ہمارے ربّ! تو ہمیں عطا فرما اپنے پاس سے رحمت اور آسان فرما دے ہمارے لیے ہمارے معاملات میں عافیت کا راستہ۔‘‘

اپنے خاص خزانۂ فضل سے ہمارے لیے رحمت کا بندوبست فرما دے۔

آیت ۱۱ ﴿فَضَرَبْنَا عَلٰٓی اٰذَانِهِمْ فِی الْکَهْفِ سِنِیْنَ عَدَدًا ۝۱۱﴾ ’’تو ہم نے تھپکی دے دی ان کے کانوں پر غار میں کئی سال کے لیے۔‘‘

یعنی ہم نے غار کے اندر متعدد سال تک انہیں سلائے رکھا۔ یہاں پر یہ بحث نہیں چھیڑی گئی کہ کتنے سال تک انہیں نیند کی حالت میں رکھا گیا۔

آیت ۱۲ ﴿ثُمَّ بَعَثْنٰهُمْ لِنَعْلَمَ اَیُّ الْحِزْبَیْنِ اَحْصٰی لِمَا لَبِثُوْٓا اَمَدًا ۝۱۲﴾ ’’پھر ہم نے

انہیں اٹھایا تاکہ ہم دیکھیں کہ دو گروہوں میں سے کس کو بہتر معلوم ہے کہ کتنا عرصہ وہ وہاں رہے تھے۔‘‘

ان دو گروہوں سے کون لوگ مراد ہیں‘ اس کا ذکر آگے آئے گا۔

آیت ۱۳ ﴿نَحْنُ نَقُصُّ عَلَیْكَ نَبَاَهُمْ بِالْحَقِّ ؕ﴾ ’’ہم سنا رہے ہیں آپؐ کو ان کا قصہ حق کے ساتھ۔‘‘

یہ واقعہ جیسے وقوع پذیر ہوا تھا بالکل ویسے ہی ہم آپؐ کو بلاکم و کاست سنانے جا رہے ہیں۔

﴿اِنَّهُمْ فِتْیَةٌ اٰمَنُوْا بِرَبِّهِمْ وَزِدْنٰهُمْ هُدًی ۝۱۳﴾ ’’وہ چند نوجوان تھے جو ایمان لائے اپنے رب پر اور ہم نے خوب بڑھایا تھا انہیں ہدایت میں۔‘‘

آیت ۱۴ ﴿وَّرَبَطْنَا عَلٰی قُلُوْبِهِمْ اِذْ قَامُوْا﴾ ’’اور ہم نے مضبوط کر دیا ان کے دلوں کو جب وہ (بادشاہ کے سامنے) کھڑے ہوئے‘‘

﴿فَقَالُوْا رَبُّنَا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَنْ نَّدْعُوَا مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلٰهًا لَّقَدْ قُلْنَآ اِذًا شَطَطًا ۝۱۴﴾ ’’تو انہوں نے کہا کہ ہمارا رب تو وہ ہے جو آسمانوں اور زمین کا ربّ ہے‘ ہم ہرگز نہیں پکاریں گے اُس کے سوا کسی اور کو معبود‘ (اگر ایسا ہوا) تب تو ہم بہت غلط بات کہیں گے۔‘‘

جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام نے نمرود کے دربار میں ڈٹ کر حق بات کہی تھی ویسے ہی ان نوجوانوں نے بھی علی الاعلان کہا کہ ہم ربّ کائنات کو چھوڑ کر کسی دیوی یا دیوتا کو اپنا ربّ ماننے کو تیار نہیں ہیں۔

آیت ۱۵ ﴿هٰٓؤُلَآءِ قَوْمُنَا اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً ؕ﴾ ’’ہماری اس قوم نے بنا لیے ہیں اُس کے سوا دوسرے معبود۔‘‘

﴿لَوْلَا یَاْتُوْنَ عَلَیْهِمْ بِسُلْطٰنٍۢ بَیِّنٍ ؕ﴾ ’’تو کیوں نہیں پیش کرتے وہ ان کے بارے میں کوئی واضح دلیل؟‘‘

اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل شدہ کوئی دلیل یا سند وہ اپنے اس دعوے کے ساتھ کیوں پیش نہیں کرتے؟

﴿فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی عَلَی اللّٰهِ كَذِبًا ۝۱۵﴾ ’’تو اُس شخص سے بڑھ کر کون

ظالم ہوگا جس نے اللہ پر جھوٹ باندھا!‘‘

شاہی دربار میں اس تند و تیز مکالمے کے بعد جب انہیں چند دن کی مہلت کے ساتھ اپنا دین چھوڑنے یا موت کا سامنا کرنے کے بارے میں فیصلہ کرنے کا اختیار دے دیا گیا تو وہ آپس میں یوں مشورہ کرنے لگے:

آیت ۱۶ ﴿وَاِذِ اعْتَزَلْتُمُوْهُمْ وَمَا يَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ فَاْوٗٓا اِلَى الْكَهْفِ يَنْشُرْ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِّنْ رَّحْمَتِهٖ وَيُهَيِّئْ لَكُمْ مِّنْ اَمْرِكُمْ مِّرْفَقًا ﴿۱۶﴾﴾ ’’اور اب جبکہ تم نے خود کو اُن لوگوں سے اور جن کی وہ اللہ کے سوا پرستش کرتے ہیں‘ ان سے علیحدہ کر لیا ہے تو اب کسی غار میں پناہ لے لو‘ تمہارا رب پھیلا دے گا تمہارے لیے اپنی رحمت اور تمہارے معاملے میں تمہارے لیے سہولت کا سامان پیدا فرما دے گا۔‘‘

آیات ۱۷ تا ۲۶

وَتَرَى الشَّمْسَ اِذَا طَلَعَتْ تَّزٰوَرُ عَنْ كَهْفِهِمْ ذَاتَ الْيَمِيْنِ وَاِذَا غَرَبَتْ تَّقْرِضُهُمْ ذَاتَ الشِّمَالِ وَهُمْ فِيْ فَجْوَةٍ مِّنْهُ ؕ ذٰلِكَ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ ؕ مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ ۚ وَمَنْ يُّضْلِلْ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ وَلِيًّا مُّرْشِدًا ﴿۱۷﴾ وَتَحْسَبُهُمْ اَيْقَاظًا وَّهُمْ رُقُوْدٌ ۚ وَّنُقَلِّبُهُمْ ذَاتَ الْيَمِيْنِ وَذَاتَ الشِّمَالِ ۚ وَكَلْبُهُمْ بَاسِطٌ ذِرَاعَيْهِ بِالْوَصِيْدِ ؕ لَوِ اطَّلَعْتَ عَلَيْهِمْ لَوَلَّيْتَ مِنْهُمْ فِرَارًا وَّلَمُلِئْتَ مِنْهُمْ رُعْبًا ﴿۱۸﴾ وَكَذٰلِكَ بَعَثْنٰهُمْ لِيَتَسَآءَلُوْا بَيْنَهُمْ ؕ قَالَ قَآئِلٌ مِّنْهُمْ كَمْ لَبِثْتُمْ ؕ قَالُوْا لَبِثْنَا يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ؕ قَالُوْا رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثْتُمْ ؕ فَابْعَثُوْٓا اَحَدَكُمْ بِوَرِقِكُمْ هٰذِهٖٓ اِلَى الْمَدِيْنَةِ فَلْيَنْظُرْ اَيُّهَآ اَزْكٰى طَعَامًا فَلْيَاْتِكُمْ بِرِزْقٍ مِّنْهُ وَلْيَتَلَطَّفْ وَلَا يُشْعِرَنَّ بِكُمْ اَحَدًا ﴿۱۹﴾ اِنَّهُمْ اِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ يَرْجُمُوْكُمْ اَوْ يُعِيْدُوْكُمْ فِيْ مِلَّتِهِمْ وَلَنْ تُفْلِحُوْٓا اِذًا اَبَدًا ﴿۲۰﴾ وَكَذٰلِكَ اَعْثَرْنَا عَلَيْهِمْ لِيَعْلَمُوْٓا اَنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّاَنَّ السَّاعَةَ لَا رَيْبَ فِيْهَا ۚ اِذْ يَتَنَازَعُوْنَ بَيْنَهُمْ اَمْرَهُمْ فَقَالُوا ابْنُوْا عَلَيْهِمْ بُنْيَانًا ؕ رَبُّهُمْ اَعْلَمُ بِهِمْ ؕ قَالَ الَّذِيْنَ غَلَبُوْا عَلٰٓى اَمْرِهِمْ لَنَتَّخِذَنَّ عَلَيْهِمْ مَّسْجِدًا ﴿۲۱﴾ سَيَقُوْلُوْنَ ثَلٰثَةٌ

رَّابِعُهُمْ كَلْبُهُمْ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ خَمْسَةٌ سَادِسُهُمْ كَلْبُهُمْ رَجْمًۢا بِالْغَيْبِ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ سَبْعَةٌ وَّثَامِنُهُمْ كَلْبُهُمْ ؕ قُلْ رَّبِّيْٓ اَعْلَمُ بِعِدَّتِهِمْ مَّا يَعْلَمُهُمْ اِلَّا قَلِيْلٌ ۬ فَلَا تُمَارِ فِيْهِمْ اِلَّا مِرَآءً ظَاهِرًا ۪ وَّلَا تَسْتَفْتِ فِيْهِمْ مِّنْهُمْ اَحَدًا ﴿۲۲﴾ وَلَا تَقُوْلَنَّ لِشَايْءٍ اِنِّيْ فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا ﴿۲۳﴾ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ۡ وَاذْكُرْ رَّبَّكَ اِذَا نَسِيْتَ وَقُلْ عَسٰٓى اَنْ يَّهْدِيَنِ رَبِّيْ لِاَقْرَبَ مِنْ هٰذَا رَشَدًا ﴿۲۴﴾ وَلَبِثُوْا فِيْ كَهْفِهِمْ ثَلٰثَ مِائَةٍ سِنِيْنَ وَازْدَادُوْا تِسْعًا ﴿۲۵﴾ قُلِ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثُوْا ۚ لَهٗ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ اَبْصِرْ بِهٖ وَاَسْمِعْ ؕ مَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِيٍّ ۡ وَّلَا يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهٖٓ اَحَدًا ﴿۲۶﴾

آیت ۱۷ ﴿وَتَرَى الشَّمْسَ اِذَا طَلَعَتْ تَّزٰوَرُ عَنْ كَهْفِهِمْ ذَاتَ الْيَمِيْنِ﴾ ’’اور تم سورج کو دیکھتے کہ جب وہ طلوع ہوتا تو اُن کی غار سے داہنی طرف ہٹ جاتا‘‘

﴿وَاِذَا غَرَبَتْ تَّقْرِضُهُمْ ذَاتَ الشِّمَالِ﴾ ’’اور جب وہ غروب ہوتا تو بائیں جانب ان سے کنّی کترا جاتا‘‘

یعنی اس غار کا منہ شمال کی طرف تھا جس کی وجہ سے سورج کی براہِ راست روشنی یا دھوپ اس میں دن کے کسی وقت بھی نہیں پڑتی تھی۔ ہمارے ہاں بھی دھوپ اور سائے کا یہی اصول کارفرما ہے۔ سورج کسی بھی موسم میں شمال کی طرف نہیں جاتا۔ اسی اصول کے تحت کارخانوں وغیرہ کی بڑی بڑی عمارات میں یہاں north light shells کا اہتمام کیا جاتا ہے تاکہ ایسے shells سے روشنی تو بلڈنگ میں آئے مگر دھوپ براہِ راست نہ آئے۔

﴿وَهُمْ فِيْ فَجْوَةٍ مِّنْهُ ؕ﴾ ’’اور وہ اس کی کھلی جگہ میں (لیٹے ہوئے) تھے۔‘‘

یعنی غار اندر سے کافی کشادہ تھی اور اصحاب کہف اس کے اندر کھلی جگہ میں سوئے ہوئے تھے۔

﴿ذٰلِكَ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ ؕ﴾ ’’یہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہے۔‘‘

﴿مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ ۚ وَمَنْ يُّضْلِلْ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ وَلِيًّا مُّرْشِدًا ﴿۱۷﴾﴾ ’’جسے اللہ ہدایت دیتا ہے وہی ہدایت یافتہ ہوتا ہے‘ اور جسے وہ گمراہ کر دے تو اُس کے لیے تم

نہیں پاؤ گے کوئی مددگار راہ پر لانے والا۔‘‘

آیت ۱۸ ﴿وَتَحْسَبُهُمْ اَيْقَاظًا وَّهُمْ رُقُوْدٌ ۚ وَّنُقَلِّبُهُمْ ذَاتَ الْيَمِيْنِ وَذَاتَ الشِّمَالِ ۚ﴾ ’’اور (اگر تم انہیں دیکھتے تو) تم سمجھتے کہ وہ جاگ رہے ہیں حالانکہ وہ سو رہے تھے‘ اور ہم ان کی کروٹیں بھی بدلتے رہے دائیں اور بائیں‘‘

گویا اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو ان کی دیکھ بھال کے لیے نرسنگ ڈیوٹی پر مامور کر رکھا تھا‘ جو وقفے وقفے سے ان کی کروٹیں بدلتے رہے تاکہ سالہا سال تک ایک ہی پہلو پر لیٹے رہنے سے وہ bed sores جیسی کسی تکلیف سے محفوظ رہیں۔

﴿وَكَلْبُهُمْ بَاسِطٌ ذِرَاعَيْهِ بِالْوَصِيْدِ ۭ﴾ ’’اور اُن کا کُتّا اپنے دونوں ہاتھ پھیلائے ہوئے (بیٹھا) تھا دہلیز پر‘‘

اس دوران ان کا کُتّا اپنی اگلی دونوں ٹانگیں سامنے پھیلا کر کُتّوں کے بیٹھنے کے مخصوص انداز میں غار کے دہانے پر بیٹھا رہا۔

﴿لَوِ اطَّلَعْتَ عَلَيْهِمْ لَوَلَّيْتَ مِنْهُمْ فِرَارًا وَّلَمُلِئْتَ مِنْهُمْ رُعْبًا ۱۸﴾ ’’اگر تم ان پر جھانکتے تو ان سے پیٹھ پھیر کر بھاگ جاتے اور تم پر ان کی طرف سے ہیبت طاری ہو جاتی۔‘‘

ایک ویرانے میں اندھیری غار اور اُس کے سامنے اپنے بازو پھیلائے بیٹھا ہوا ایک خوفناک کُتّا! یہ ایک ایسا منظر تھا جسے جو بھی دیکھتا ڈر کے مارے وہاں سے بھاگنے میں ہی عافیت سمجھتا۔

آیت ۱۹ ﴿وَكَذٰلِكَ بَعَثْنٰهُمْ لِيَتَسَاۗءَلُوْا بَيْنَهُمْ ۭ﴾ ’’اور اسی طرح ہم نے انہیں اٹھایا تاکہ وہ آپس میں ایک دوسرے سے پوچھیں۔‘‘

﴿قَالَ قَاۗىِٕلٌ مِّنْهُمْ كَمْ لَبِثْتُمْ ۭ﴾ ’’ان میں سے ایک کہنے والے نے کہا کہ تم کتنا عرصہ یہاں رہے ہو گے؟‘‘

﴿قَالُوْا لَبِثْنَا يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ۭ قَالُوْا رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثْتُمْ ۭ﴾ ’’کچھ بولے کہ ہم رہے ہیں ایک دن یا دن کا کچھ حصہ۔ کچھ (دوسرے) بولے کہ تمہارا رب خوب جانتا ہے تم کتنا عرصہ رہے ہو!‘‘

جب کچھ ساتھیوں نے اپنی رائے کا اظہار کیا کہ انہوں نے ایک دن یا اس سے کچھ کم وقت نیند میں گزارا ہے تو ان کے جواب پر کچھ دوسرے ساتھی بول پڑے کہ اس بحث کو چھوڑ دو‘ اللہ کو سب پتا ہے کہ تم لوگ یہاں کتنا عرصہ تک سوئے رہے ہو۔

﴿فَابْعَثُوْٓا اَحَدَكُمْ بِوَرِقِكُمْ هٰذِهٖٓ اِلَى الْمَدِيْنَةِ﴾ ’’اب تم بھیجو اپنے میں سے ایک (ساتھی) کو اپنے اس چاندی کے سکے کے ساتھ شہر کی طرف‘‘

﴿فَلْيَنْظُرْ اَيُّهَآ اَزْكٰى طَعَامًا فَلْيَاْتِكُمْ بِرِزْقٍ مِّنْهُ﴾ ’’تو وہ دیکھے کہ شہر کے کس حصے سے زیادہ پاکیزہ کھانا ملتا ہے اور وہ وہاں سے تمہارے لیے کچھ کھانا لے آئے۔‘‘

ظاہر ہے کہ اپنے اعتقاد اور نظریے کے مطابق انہیں پاکیزہ کھانا ہی چاہیے تھا۔

﴿وَلْيَتَلَطَّفْ﴾ ’’اور وہ نرمی کا معاملہ کرے‘‘

یعنی جو ساتھی کھانا لینے کے لیے جائے وہ لوگوں سے بات چیت اور لین دین کرتے ہوئے خصوصی طور پر اپنا رویہ نرم رکھے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ کسی سے جھگڑ پڑے اور اس طرح ہم سب کے لیے کوئی مسئلہ کھڑا ہو جائے۔

یہاں پر نوٹ کر لیجیے کہ قرآن کے حروف کی گنتی کے اعتبار سے لفظ وَلْيَتَلَطَّفْ کی ’’ت‘‘ پر قرآن کا نصف اوّل پورا ہو گیا ہے اور اس کے بعد لفظ ’’ل‘‘ سے نصف ثانی شروع ہو رہا ہے۔

﴿وَلَا يُشْعِرَنَّ بِكُمْ اَحَدًا ۱۹﴾ ’’اور وہ آگاہ نہ کر دے تمہارے بارے میں کسی کو۔‘‘

آیت ۲۰ ﴿اِنَّهُمْ اِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ يَرْجُمُوْكُمْ اَوْ يُعِيْدُوْكُمْ فِيْ مِلَّتِهِمْ وَلَنْ تُفْلِحُوْٓا اِذًا اَبَدًا ۲۰﴾ ’’کیونکہ اگر انہوں نے تم پر قابو پا لیا تو وہ تمہیں سنگسار کر دیں گے یا تمہیں واپس لے جائیں گے اپنے دین میں‘ اور تب تو تم کبھی بھی فلاح نہیں پا سکو گے۔‘‘

اگر انہوں نے تمہیں مجبور کر دیا کہ تم پھر سے ان کا دین قبول کر لو تو ایسی صورت میں تم ہمیشہ کے لیے ہدایت سے دور ہو جاؤ گے۔

آیت ۲۱ ﴿وَكَذٰلِكَ اَعْثَرْنَا عَلَيْهِمْ﴾ ’’اور اس طرح ہم نے مطلع کر دیا (لوگوں کو) ان پر‘‘

چنانچہ اصحاب کہف کا ایک ساتھی جب کھانا لینے کے لیے شہر گیا تو اپنے لباس‘ حلیے اور کرنسی وغیرہ کے باعث فوری طور پر اسے پہچان لیا گیا کہ وہ موجودہ زمانے کا انسان نہیں ہے۔ پھر جب اس سے تفتیش کی گئی تو سارا راز کھل گیا۔ اس وقت اگرچہ اس واقعہ کو تین سو سال سے زائد کا عرصہ گزر چکا تھا مگر اس کے باوجود یہ بات ابھی تک لوگوں کے علم میں تھی کہ فلاں بادشاہ کے ڈر سے اس شہر سے سات آدمی کہیں روپوش ہو گئے تھے اور پوری مملکت میں تلاش بسیار کے باوجود کہیں ان کا سراغ نہ مل سکا تھا۔ اسی طرح یہ بات بھی لوگوں کے علم میں تھی کہ اس پورے واقعے کو ایک تختی پر لکھ کر ریکارڈ کے طور پر شاہی خزانے میں محفوظ کر لیا گیا تھا۔ لہٰذا اصحاب کہف کے ساتھی سے ملنے والی معلومات کی تصدیق کے لیے جب مذکورہ تختی ریکارڈ سے نکلوائی گئی تو اس پر اس واقعہ کی تمام تفصیلات لکھی ہوئی مل گئیں اور یوں یہ واقعہ پوری وضاحت کے ساتھ لوگوں کے سامنے آ گیا۔

﴿لِيَعْلَمُوْٓا اَنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّاَنَّ السَّاعَةَ لَا رَيْبَ فِيْهَا﴾ ’’تاکہ وہ جان لیں کہ اللہ کا وعدہ سچا ہے اور یہ کہ قیامت کے بارے میں ہرگز کوئی شک نہیں۔‘‘

یہ واقعہ گویا بعث بعد الموت کے بارے میں ایک واضح دلیل تھا کہ جب اللہ تعالیٰ نے تین سو سال تک ان لوگوں کو سلائے رکھا اور پھر اٹھا کھڑا کیا تو اُس کے لیے مُردوں کا دوبارہ زندہ کرنا کیونکر ممکن نہیں ہوگا؟

﴿اِذْ يَتَنَازَعُوْنَ بَيْنَهُمْ اَمْرَهُمْ﴾ ’’جب وہ لوگ آپس میں جھگڑ رہے تھے ان کے معاملے میں‘‘

اس کے بعد اصحابِ کہف تو اپنی غار میں پہلے کی طرح سو گئے اور اللہ تعالیٰ نے ان پر حقیقی موت وارد کر دی‘ لیکن لوگوں کے درمیان اس بارے میں اختلاف پیدا ہو گیا کہ ان کے بارے میں حتمی طور پر کیا معاملہ کیا جائے۔

﴿فَقَالُوا ابْنُوْا عَلَيْهِمْ بُنْيَانًا ۭ رَبُّهُمْ اَعْلَمُ بِهِمْ ۭ﴾ ’’چنانچہ کچھ لوگوں نے کہا کہ تعمیر کر دو ان پر ایک عمارت (بطور یادگار)‘ ان کا رب ان سے بہتر واقف ہے۔‘‘

کچھ لوگوں نے رائے دی کہ اس معاملہ کی اہمیت کے پیش نظر یہاں ایک شاندار یادگار تعمیر کی جانی چاہیے۔

﴿قَالَ الَّذِيْنَ غَلَبُوْا عَلٰٓى اَمْرِهِمْ لَنَتَّخِذَنَّ عَلَيْهِمْ مَّسْجِدًا ﴿٢١﴾﴾ ’’جو لوگ غالب آئے اپنی رائے کے اعتبار سے انہوں نے کہا کہ ہم بنائیں گے ان (کی غار) پر ایک مسجد۔‘‘

آیت ۲۲ ﴿سَيَقُوْلُوْنَ ثَلٰثَةٌ رَّابِعُهُمْ كَلْبُهُمْ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ خَمْسَةٌ سَادِسُهُمْ كَلْبُهُمْ رَجْمًۢا بِالْغَيْبِ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ سَبْعَةٌ وَّثَامِنُهُمْ كَلْبُهُمْ ۭ﴾ ’’اب یہ لوگ کہیں گے کہ وہ تین تھے‘ اُن کا چوتھا اُن کا کتّا تھا‘ اور کچھ لوگ کہیں گے کہ وہ پانچ تھے‘ اُن کا چھٹا ان کا کُتّا تھا‘ یہ سب تیر تکّے چلا رہے ہیں اندھیرے میں‘ اور کچھ لوگ کہیں گے کہ وہ سات تھے اور ان کا آٹھواں اُن کا کتا تھا۔‘‘

﴿قُلْ رَّبِّيْٓ اَعْلَمُ بِعِدَّتِهِمْ مَّا يَعْلَمُهُمْ اِلَّا قَلِيْلٌ ۚ﴾ ’’آپ کہیے: میرا رب بہتر جانتا ہے ان کی تعداد کو‘ نہیں جانتے ان (کے معاملے) کو مگر بہت تھوڑے لوگ۔‘‘

قرآن مجید میں ان کی تعداد کے بارے میں صراحت تو نہیں کی گئی مگر اکثر مفسرین کے مطابق بین السطور میں آخری رائے کے درست ہونے کے شواہد موجود ہیں۔ اس میں ایک نکتہ تو یہ ہے کہ پہلے فقرے ﴿ثَلٰثَةٌ رَّابِعُهُمْ كَلْبُهُمْ ۚ﴾ اور دوسرے فقرے ﴿خَمْسَةٌ سَادِسُهُمْ كَلْبُهُمْ﴾ کے درمیان میں ’’و‘‘ نہیں ہے‘ جبکہ تیسرے فقرے میں ﴿سَبْعَةٌ وَّثَامِنُهُمْ كَلْبُهُمْ ۭ﴾ کے درمیان میں ’’و‘‘ موجود ہے۔ چنانچہ پہلے دونوں کلمات کے مقابلے میں تیسرے کلمہ کے بیان میں ’’و‘‘ کی وجہ سے زیادہ زور ہے۔

اس ضمن میں دوسرا نکتہ یہ ہے کہ جب وہ لوگ جاگے تھے تو اُن میں سے ایک نے سوال کیا تھا: ﴿كَمْ لَبِثْتُمْ ۭ﴾ کہ تم یہاں کتنی دیر سوئے رہے ہو؟ اس سوال کا جواب قرآن حکیم میں بایں الفاظ نقل ہوا ہے: ﴿قَالُوْا لَبِثْنَا يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ۭ﴾ انہوں نے کہا کہ ہم ایک دن یا ایک دن سے کچھ کم عرصہ تک سوئے رہے ہیں۔ یہاں پر قَالُوْا چونکہ جمع کا صیغہ ہے اس لیے یہ جواب دینے والے کم از کم تین لوگ تھے‘ جبکہ اس سوال کے جواب میں ان کے جن ساتھیوں نے دوسری رائے دی تھی وہ بھی کم از کم تین ہی تھے‘ کیونکہ ان کے لیے بھی قَالُوْا جمع کا صیغہ ہی استعمال ہوا ہے: ﴿قَالُوْا رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثْتُمْ ۭ﴾۔ اس طرح ان کی تعداد سات ہی درست معلوم ہوتی ہے۔ یعنی ایک پوچھنے والا‘ تین لوگ ایک رائے دینے والے اور ان کے جواب

میں تین لوگ دوسری رائے کا اظہار کرنے والے۔

اس کے علاوہ قدیم رومن لٹریچر میں بھی جہاں ان کا ذکر ملتا ہے وہاں ان کی تعداد سات ہی بتائی گئی ہے۔ قبل ازیں گبن کی کتاب کا حوالہ بھی دیا جا چکا ہے جس میں Seven Sleepers کا ذکر ہے۔ لیکن یہاں جس بات کی طرف خاص طور پر توجہ دلائی گئی ہے وہ یہ ہے کہ اس معاملے میں بحث کرنے اور جھگڑنے کی ضرورت ہی نہیں ہے:

﴿فَلَا تُمَارِ فِيْهِمْ اِلَّا مِرَآءً ظَاهِرًا ۪ وَّلَا تَسْتَفْتِ فِيْهِمْ مِّنْهُمْ اَحَدًا ﴿۲۲﴾﴾ ''تو (اے نبی ﷺ!) آپ ان کے بارے میں جھگڑا مت کریں سوائے سرسری بحث کے' اور نہ ہی آپ پوچھئے ان کے بارے میں ان میں سے کسی سے۔''

یعنی جو بات دعوتِ دین اور اقامت دین کے حوالے سے اہم نہ ہو اس میں بے مقصد چھان بین کرنا اور بحث و نزاع میں پڑنا' گویا وقت ضائع کرنے اور اپنی جدوجہد کو نقصان پہنچانے کے مترادف ہے۔

آیت ۲۳ ﴿وَلَا تَقُوْلَنَّ لِشَايْءٍ اِنِّيْ فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا ﴿۲۳﴾﴾ ''اور کسی چیز کے بارے میں کبھی یہ نہ کہا کریں کہ میں یہ کام کل ضرور کر دوں گا۔''

اس آیت میں ایک بہت اہم واقعہ کا حوالہ ہے۔ جب اہل مکہ نے رسول اللہ ﷺ سے سوالات کیے تو آپؐ نے فرمایا کہ میں آپ لوگوں کو ان سوالات کے جوابات کل دے دوں گا۔ اس موقع پر آپ ﷺ نے سہواً ''ان شاء اللّٰہ'' نہیں فرمایا۔ اس کے بعد کئی روز تک وحی نہ آئی۔ یہ صورت حال آپؐ کے لیے انتہائی پریشان کن تھی۔ مخالفین خوشی میں تالیاں پیٹ رہے ہوں گے' آپؐ کو ناکامی کے طعنے دے رہے ہوں گے اور آپؐ کو یہ سب کچھ برداشت کرنا پڑ رہا ہوگا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے محبوب بندوں کو کیسی کیسی سخت آزمائشوں سے دوچار کرتا ہے: ع ''جن کے رتبے ہیں سوا اُن کی سوا مشکل ہے!''

عام لوگ اپنی روزمرہ کی گفتگو میں کیسی کیسی لایعنی باتیں کرتے رہتے ہیں لیکن اللہ کے ہاں ان کی پکڑ نہیں ہوتی' اس لیے کہ وہ اللہ کے ہاں اہم نہیں ہوتے' مگر یہاں ایک انتہائی مقرب ہستی سے سہواً ایک کلمہ ادا ہونے سے رہ گیا تو باوجود اس کے کہ معاملہ بے حد حساس تھا' وحی روک لی گئی۔ بالآخر کئی روز کے بعد جب اللہ کو منظور ہوا تو حضرت جبرائیل علیہ السلام سوالات کے جوابات بھی لے کر آئے اور ساتھ یہ ہدایت بھی کہ کبھی کسی چیز کے بارے میں یوں نہ کہیں

کہ میں کل یہ کروں گا:

آیت ۲۴ ﴿اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ﴾ ''مگر یہ کہ اللہ چاہے!''

یعنی مستقبل کے بارے میں جب بھی کوئی بات کریں تو ''ان شاء اللّٰہ'' ضرور کہیں کہ اگر اللہ نے چاہا تو میں یوں کروں گا۔ اللہ تعالیٰ کا مسلمانوں پر یہ خصوصی فضل ہے کہ انہیں اپنی معاشرتی زندگی میں روزمرہ کے معمولات کے لیے ایسے کلمات سکھائے گئے جن میں توحید کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ آپ نے کوئی خوبصورت چیز دیکھی جس سے آپ کا دل خوش ہوا' آپ نے کہا: **سبحان اللّٰہ!** گویا آپ نے اقرار کیا کہ یہ اس چیز کا کمال نہیں اور نہ ہی یہ چیز بذاتِ خود لائق تعریف ہے بلکہ تعریف تو اللہ کی ہے جس نے یہ خوبصورت چیز بنائی۔ آپ کی کوئی تکلیف دور ہوئی تو منہ سے نکلا: **الحمد للّٰہ!** یعنی جو بھی مشکل آسان ہوئی اللہ کی مدد' اُس کی مہربانی اور اُس کے حکم سے ہوئی' لہٰذا شکر بھی اُسی کا ادا کیا جائے گا۔ آپ اپنے گھر میں داخل ہوئے' اہل و عیال کو خوش و خرم پایا' آپ نے کہا: **مَاشَاءَ اللّٰہ!** کہ اس میں میرا یا کسی اور کا کوئی کمال نہیں' یہ سب اللہ کی مرضی اور مشیت سے ہے۔ اسی طرح مستقبل میں کسی کام کے کرنے کے بارے میں اظہار کیا تو ساتھ **اِن شاءَ اللّٰہ** کہا۔ یعنی میرا ارادہ تو یوں ہے مگر صرف میرے ارادے سے کیا ہوتا ہے' حقیقت میں یہ کام تبھی ہوگا اور میں اسے تبھی کر پاؤں گا جب اللہ کو منظور ہوگا' کیونکہ اللہ کی مشیت اور مرضی کے بغیر کچھ نہیں ہو سکتا۔ گویا ان کلمات کے ذریعے قدم قدم پر اور بات بات میں ہمیں توحید کا سبق یاد دلایا جاتا ہے۔ اللہ کے علم' اُس کے حکم' اُس کے اختیار و اقتدار' اُس کی قدرت' اُس کی مشیت کے مطلق اور فائق ہونے کے اقرار کی ترغیب دی جاتی ہے۔ ان میں سے زیادہ تر کلمات (اَلْحَمْدُ لِلّٰہ' اِنْ شَاءَ اللّٰہ' مَاشَاءَ اللّٰہ) اس سورت میں موجود ہیں۔

﴿وَاذْكُرْ رَّبَّكَ اِذَا نَسِيْتَ﴾ ''اور اپنے رب کو یاد کر لیا کیجئے جب آپ بھول جائیں''

اگر کسی وقت بھول جائیں تو یاد آنے پر دوبارہ اللہ کی طرف اپنا دھیان لگا لیجئے۔

﴿وَقُلْ عَسٰٓى اَنْ يَّهْدِيَنِ رَبِّيْ لِاَقْرَبَ مِنْ هٰذَا رَشَدًا ﴿۲۴﴾﴾ ''اور کہیے: ہو سکتا ہے کہ میرا رب میری راہنمائی کر دے اس سے بہتر بھلائی کی طرف۔''

یعنی کسی بھی کام کے لیے کوشش کرتے ہوئے انسان کو ''تفویض الامر الی اللہ'' کی

کیفیت میں رہنا چاہیے کہ اگر اللہ کو منظور ہوا تو میں اس کوشش میں کامیاب ہو جاؤں گا‘ ورنہ ہو سکتا ہے میرا رب میرے لیے اس سے بھی بہتر کسی کام کے لیے اسباب پیدا فرما دے۔ گویا انسان اپنے تمام معاملات ہر وقت اللہ تعالیٰ کے سپرد کیے رکھے:

سپردم بتو مایۂ خویش را تو دانی حسابِ کم و بیش را!

آیت ۲۵ ﴿وَلَبِثُوْا فِیْ كَهْفِهِمْ ثَلٰثَ مِائَةٍ سِنِیْنَ وَازْدَادُوْا تِسْعًا ﴿۲۵﴾﴾ ’’اور وہ رہے اپنی غار میں تین سو برس اور اس کے اوپر نو برس۔‘‘

یعنی غار میں ان کے سونے کی مدت شمسی کیلنڈر میں تین سو سال جبکہ قمری کیلنڈر کے مطابق تین سو نو سال بنتی ہے۔

آیت ۲۶ ﴿قُلِ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثُوْا ۚ﴾ ’’آپؐ کہیے کہ اللہ بہتر جانتا ہے اس میں جتنا (عرصہ) وہ رہے‘‘

یعنی اس بحث میں بھی پڑنے کی ضرورت نہیں کہ وہ غار میں کتنا عرصہ سوئے رہے۔ اس کا جواب بھی آپؐ ان کو یہی دیں کہ اس مدت کے بارے میں بھی اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔

﴿لَهٗ غَیْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ اَبْصِرْ بِهٖ وَاَسْمِعْ ؕ﴾ ’’اُسی کے لیے ہے آسمانوں اور زمین کا غیب۔ کیا ہی خوب ہے وہ اس کو دیکھنے والا اور کیا ہی خوب ہے وہ سننے والا!‘‘

﴿مَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِیٍّ ۪ وَّلَا یُشْرِكُ فِیْ حُكْمِهٖۤ اَحَدًا ﴿۲۶﴾﴾ ’’اُس کے سوا ان کا کوئی مددگار نہیں‘ اور وہ شریک نہیں کرتا اپنے حکم میں کسی کو بھی۔‘‘

اُس کے سوا ان کا کوئی ساتھی‘ کارساز‘ مددگار‘ حمایتی اور پشت پناہ نہیں ہے۔ لفظ ’’ولی‘‘ ان سب معانی کا احاطہ کرتا ہے۔

وہ اپنے اختیار اور اپنی حاکمیت کے حق میں کسی دوسرے کو شریک نہیں کرتا۔ یہ توحید حاکمیت ہے۔ اس بارے میں سورۂ یوسف (آیت ۴۰ و ۶۷) میں اس طرح ارشاد ہوا: ﴿اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ﴾ ’’اختیارِ مطلق تو صرف اللہ ہی کا ہے‘‘۔ جبکہ سورۂ بنی اسرائیل کی آخری آیت میں یوں فرمایا گیا: ﴿وَلَمْ یَكُنْ لَّهٗ شَرِیْكٌ فِی الْمُلْكِ﴾ ’’اور اُس کا کوئی شریک نہیں ہے بادشاہت میں۔‘‘

تصورِ توحید کی نعمت

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

سورۃ الزمر میں ارشاد ہوا:

﴿ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا رَّجُلًا فِيْهِ شُرَكَآءُ مُتَشٰكِسُوْنَ وَرَجُلًا سَلَمًا لِّرَجُلٍ ؕ هَلْ يَسْتَوِيٰنِ مَثَلًا ؕ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۲۹﴾﴾

''اللہ ایک مثال دیتا ہے' ایک شخص تو وہ ہے جس کی ملکیت میں بہت سے کج خلق آقا شریک ہیں جو اسے اپنی اپنی طرف کھینچتے ہیں اور دوسرا شخص پورا کا پورا ایک ہی آقا کا غلام ہے۔ کیا ان دونوں کا حال یکساں ہوسکتا ہے؟ الحمدللہ! مگر اکثر لوگ نادانی میں پڑے ہوئے ہیں۔''

اس مثال میں اللہ تعالیٰ نے شرک اور توحید کے فرق اور انسان کی زندگی پر دونوں کے اثرات کو اس طرح کھول کر بیان فرما دیا ہے کہ اس سے زیادہ مختصر الفاظ میں اتنا بڑا مضمون اتنے مؤثر طریقے سے سمجھا دینا ممکن نہیں ہے۔ یہ بات ہر آدمی تسلیم کرے گا کہ جس شخص کے بہت سے مالک یا آقا ہوں' اور ہر ایک اس کو اپنی اپنی طرف کھینچ رہا ہو' اور وہ مالک بھی ایسے بدمزاج ہوں کہ ہر ایک اس سے خدمت لیتے ہوئے دوسرے مالک کے حکم پر دوڑنے کی اسے مہلت نہ دیتا ہو' اور ان کے متضاد احکام میں جس کے حکم کی بھی وہ تعمیل سے قاصر رہ جائے وہ اسے ڈانٹنے پھٹکارنے ہی پر اکتفا نہ کرتا ہو بلکہ سزا دینے پر تل جاتا ہو' اس کی زندگی لامحالہ سخت ضیق میں ہوگی۔ اس کے برعکس وہ شخص بڑے چین اور آرام سے رہے گا جو بس ایک ہی آقا کا نوکر یا غلام ہو اور کسی دوسرے کی خدمت و رضا جوئی اسے نہ کرنی پڑے۔ یہ ایسی سیدھی سی بات ہے جسے سمجھنے کے لیے کسی بڑے غور و تامل کی حاجت نہیں ہے۔ اس کے بعد کسی شخص کے لیے یہ سمجھنا بھی مشکل نہیں رہتا کہ انسان کے لیے جو امن و اطمینان ایک خدا کی بندگی میں ہے وہ بہت سے خداؤں کی بندگی میں اسے کبھی میسر نہیں آ سکتا۔

اس مقام پر یہ بات بھی اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ بہت سے کج خلق اور باہم متنازع آقاؤں کی تمثیل پتھر کے بتوں پر راست نہیں آتی' بلکہ اُن جیتے جاگتے آقاؤں پر ہی راست

آتی ہے جو عملاً آدمی کو متضاد احکام دیتے ہیں اور فی الواقع اس کو اپنی اپنی طرف کھینچتے رہتے ہیں۔ پتھر کے بت کسے حکم دیا کرتے ہیں اور کب کسی کو کھینچ کر اپنی خدمت کے لیے بلاتے ہیں؟ یہ کام تو زندہ آقاؤں ہی کے کرنے کے ہیں۔ ایک آقا آدمی کے اپنے نفس میں بیٹھا ہوا ہے جو طرح طرح کی خواہشات اس کے سامنے پیش کرتا ہے اور اسے مجبور کرتا رہتا ہے کہ وہ اُنہیں پورا کرے۔ دوسرے بے شمار آقا گھر میں' خاندان میں' برادری میں' قوم اور ملک کے معاشرے میں' مذہبی پیشواؤں میں' حکمرانوں اور قانون سازوں میں' کاروبار اور معیشت کے دائروں میں' اور دنیا کے تمدن پر غلبہ رکھنے والی طاقتوں میں ہر طرف موجود ہیں' جن کے متضاد تقاضے اور مختلف مطالبے ہر وقت آدمی کو اپنی اپنی طرف کھینچتے رہتے ہیں اور ان میں سے جس کا تقاضا پورا کرنے میں بھی وہ کوتاہی کرتا ہے وہ اپنے دائرہ کار میں اُس کو سزا دیے بغیر نہیں چھوڑتا۔ البتہ ہر ایک کی سزا کے ہتھیار الگ الگ ہیں۔ کوئی دل مسوستا ہے' کوئی روٹھ جاتا ہے' کوئی نکو بناتا ہے' کوئی مقاطعہ کرتا ہے' کوئی دیوالہ نکالتا ہے' کوئی مذہب کا وار کرتا ہے اور کوئی قانون کی چوٹ لگاتا ہے۔ اس ضیق سے نکلنے کی کوئی صورت انسان کے لیے اس کے سوا نہیں ہے کہ وہ توحید کا مسلک اختیار کر کے صرف ایک خدا کا بندہ بن جائے اور ہر دوسرے کی بندگی کا قلادہ اپنی گردن سے اتار پھینکے۔

توحید کا مسلک اختیار کرنے کی بھی دو شکلیں ہیں' جن کے نتائج الگ الگ ہیں۔ ایک شکل یہ ہے کہ ایک فرد اپنی انفرادی حیثیت میں خدائے واحد کا بندہ بن کر رہنے کا فیصلہ کر لے اور گردوپیش کا ماحول اس معاملے میں اس کا ساتھی نہ ہو۔ اس صورت میں یہ تو ہوسکتا ہے کہ خارجی کشمکش اور ضیق اس کے لیے پہلے سے زیادہ بڑھ جائے' لیکن اگر اس نے سچے دل سے یہ مسلک اختیار کیا ہو تو اسے داخلی امن و اطمینان لازماً میسر آ جائے گا۔ وہ نفس کی ہر اُس خواہش کو رد کر دے گا جو احکامِ الٰہی کے خلاف ہو یا جسے پورا کرنے کے ساتھ خدا پرستی کے تقاضے پورے نہ کیے جا سکتے ہوں۔ وہ خاندان' برادری' قوم' حکومت' مذہبی پیشوائی اور معاشی اقتدار کے بھی ایسے مطالبے کو قبول نہ کرے گا جو خدا کے قانون سے ٹکراتا ہو۔ اس کے نتیجے میں اسے بے حد تکلیفیں پہنچ سکتی ہیں' بلکہ لازماً پہنچیں گی۔ لیکن اس کا دل پوری طرح مطمئن ہوگا کہ جس خدا کا میں بندہ ہوں اس کی بندگی کا تقاضا پورا کر رہا ہوں' اور جن کا بندہ میں نہیں ہوں ان کا مجھ پر کوئی حق نہیں ہے جس کی بنا پر میں اپنے رب کے حکم کے خلاف ان کی بندگی بجالاؤں۔ یہ دل

کا اطمینان اور روح کا امن وسکون دنیا کی کوئی طاقت اس سے نہیں چھین سکتی۔ حتیٰ کہ اگر اسے پھانسی پر بھی چڑھنا پڑ جائے تو وہ ٹھنڈے دل سے چڑھ جائے گا اور اس کو ذرا پچھتاوا نہ ہوگا کہ میں نے کیوں نہ جھوٹے خداؤں کے آگے سر جھکا کر اپنی جان بچالی۔

دوسری شکل یہ ہے کہ پورا معاشرہ اسی توحید کی بنیاد پر قائم ہو جائے اور اس میں اخلاق، تمدن، تہذیب، تعلیم، مذہب، قانون، رسم ورواج، سیاست، معیشت، غرض شعبہ زندگی کے لیے وہ اصول اعتقاداً مان لیے جائیں اور عملاً رائج ہو جائیں جو خداوندِ عالم نے اپنی کتاب اور اپنے رسول کے ذریعہ سے دیے ہیں۔ خدا کا دین جس کو گناہ کہتا ہے، قانون اسی کو جرم قرار دے، حکومت کی انتظامی مشین اسی کو مٹانے کی کوشش کرے، تعلیم وتربیت اسی سے بچنے کے لیے ذہن اور کردار تیار کرے، منبر ومحراب سے اسی کے خلاف آواز بلند ہو، معاشرہ اسی کو معیوب ٹھہرائے اور معیشت کے ہر کاروبار میں وہ ممنوع ہو جائے۔ اسی طرح خدا کا دین جس چیز کو بھلائی اور نیکی قرار دے، قانون اس کی حمایت کرے، انتظام کی طاقتیں اسے پروان چڑھانے میں لگ جائیں، تعلیم وتربیت کا پورا نظام ذہنوں میں اس کو بٹھانے اور سیرتوں میں اسے رچا دینے کی کوشش کرے، منبر ومحراب اسی کی تلقین کریں، معاشرہ اسی کی تعریف کرے اور اپنے عملی رسم ورواج اس پر قائم کر دے، اور کاروبارِ معیشت بھی اسی کے مطابق چلے۔ یہ وہ صورت ہے جس میں انسان کو کامل داخلی وخارجی اطمینان میسر آ جاتا ہے اور مادی وروحانی ترقی کے تمام دروازے اس کے لیے کھل جاتے ہیں، کیونکہ اس میں بندگیٔ رب اور بندگیٔ غیر کے تقاضوں کا تصادم قریب قریب ختم ہو جاتا ہے۔

اسلام کی دعوت اگرچہ ہر ہر فرد کو یہی ہے کہ خواہ دوسری صورت پیدا ہو یا نہ ہو، بہرحال وہ توحید ہی کو اپنا دین بنالے اور تمام خطرات ومشکلات کا مقابلہ کرتے ہوئے اللہ کی بندگی کرے۔ لیکن اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اسلام کا آخری مقصود یہی دوسری صورت پیدا کرنا ہے اور تمام انبیا علیہم السلام کی کوششوں کا مدعا یہی رہا ہے کہ ایک امت مسلمہ وجود میں آئے جو کفر اور کفار کے غلبے سے آزاد ہو کر من حیث الجماعت اللہ کے دین کی پیروی کرے۔ کوئی شخص جب تک قرآن وسنت سے ناواقف ہو اور عقل سے بے بہرہ نہ ہو، یہ نہیں کہہ سکتا کہ انبیاء علیہم السلام کی سعی وجُہد کا مقصود صرف انفرادی ایمان وطاعت ہے، اور اجتماعی زندگی میں دین حق کو نافذ وقائم کرنا سرے سے اس کا مقصد ہی نہیں رہا ہے۔ (باقی صفحہ 51 پر)

استعانت باللہ

(صرف اللہ سے مدد مانگنا)

بانیٔ تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

کا ۲۸/ فروری ۲۰۰۸ء کا خطابِ جمعہ

خطبۂ مسنونہ کے بعد:

آعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ـــــ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۙ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۙ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ؕ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ؕ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۙ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۙ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ۧ (الفاتحة)

مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَمَنْ يُّؤْمِنْ بِاللّٰهِ يَهْدِ قَلْبَهٗ ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝ (التغابن)

مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا ؕ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ۝ لِّكَيْلَا تَاْسَوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰىكُمْ ؕ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرِ ۙ (الحديد)

فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۙ اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ؕ (الانشراح)

عَنْ اَبِی الْعَبَّاسِ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَبَّاسٍ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمَا قَالَ : كُنْتُ خَلْفَ النَّبِيِّ ﷺ يَوْمًا ' فَقَالَ :

((يَا غُلَامُ! اِنِّيْ اُعَلِّمُكَ كَلِمَاتٍ :احْفَظِ اللّٰهَ يَحْفَظْكَ، احْفَظِ اللّٰهَ تَجِدْهُ تُجَاهَكَ، اِذَا سَاَلْتَ فَاسْاَلِ اللّٰهَ، وَاِذَا اسْتَعَنْتَ فَاسْتَعِنْ بِاللّٰهِ، وَاعْلَمْ اَنَّ الْاُمَّةَ لَوِ اجْتَمَعَتْ عَلٰى اَنْ يَّنْفَعُوْكَ بِشَيْءٍ لَمْ يَنْفَعُوْكَ اِلَّا بِشَيْءٍ قَدْ كَتَبَهُ اللّٰهُ لَكَ، وَاِنِ اجْتَمَعُوْا عَلٰى اَنْ يَّضُرُّوْكَ بِشَيْءٍ لَمْ يَضُرُّوْكَ اِلَّا بِشَيْءٍ قَدْ

كَتَبَهُ اللّٰهُ عَلَيْكَ، رُفِعَتِ الْاَقْلَامُ وَجَفَّتِ الصُّحُفُ)) (۱)

رواه الترمذی وقال حديث حسن صحيح، وفی رواية غير الترمذی :

((احْفَظِ اللّٰهَ تَجِدْهُ اَمَامَكَ، تَعَرَّفْ اِلَى اللّٰهِ فِي الرَّخَاءِ يَعْرِفْكَ فِي الشِّدَّةِ، وَاعْلَمْ اَنَّ مَا اَخْطَاَكَ لَمْ يَكُنْ لِيُصِيْبَكَ، وَمَا اَصَابَكَ لَمْ يَكُنْ لِيُخْطِئَكَ، وَاعْلَمْ اَنَّ النَّصْرَ مَعَ الصَّبْرِ، وَاَنَّ الْفَرَجَ مَعَ الْكَرْبِ، وَاَنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا))

سیدنا ابوالعباس' عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ایک روز میں نبی اکرم ﷺ کے پیچھے سوار تھا تو آپؐ نے فرمایا:

''اے لڑکے! میں تمہیں چند (مفید) باتیں بتاتا ہوں۔ تو اللہ تعالیٰ (کے احکام) کی حفاظت کر (اس کے احکام کی پابندی کر) وہ تیری حفاظت کرے گا۔ تو اللہ تعالیٰ (کے احکام) کی حفاظت کر' تو اسے اپنے سامنے پائے گا۔ جب تو سوال کرے تو اللہ تعالیٰ ہی سے سوال کر۔ جب تو مدد طلب کرے تو اللہ تعالیٰ ہی سے مدد مانگ۔ یاد رکھ! ساری دنیا جمع ہو کر تجھے کوئی فائدہ پہنچانا چاہے تو وہ تجھے کسی بات کا فائدہ اور نفع نہیں دے سکتی سوائے اس کے جو اللہ تعالیٰ نے تیرے لیے مقدر کر رکھا ہے' اور اگر سارے لوگ مل کر تجھے کوئی نقصان پہنچانا چاہیں تو وہ تیرا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے سوائے اس نقصان کے جو اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے مقدر کر رکھا ہو۔ قلم اٹھا لیے گئے اور صحیفے خشک ہو چکے ہیں۔'' (ترمذی نے اسے حسن صحیح کہا ہے)

ترمذی کے علاوہ دوسرے محدثین کی روایت میں یوں ہے:

''تو اللہ تعالیٰ کے احکام کی حفاظت کر' تو اسے اپنے سامنے پائے گا۔ تو خوشحالی میں اس کی طرف رجوع کر' وہ تنگ دستی کے وقت تیری مدد فرمائے گا۔ یاد رکھو! جو چیز تمہیں نہیں ملی وہ تمہیں مل ہی نہیں سکتی تھی اور جو کچھ تجھے مل گیا اس سے تو محروم نہیں رہ سکتا تھا۔ یاد رکھو! اللہ تعالیٰ کی مدد صبر سے وابستہ ہے۔ اور تکالیف و مصائب کے بعد کشادگی اور فراخی آتی ہے۔ اور تنگی کے بعد آسانی بھی ہوتی ہے۔''

(۱) سنن الترمذی' ابواب صفة القيامة والرقائق والورع' باب منه۔

معزز سامعینِ کرام!

امام یحییٰ بن شرف الدین النووی ؒ کے شہرۂ آفاق مجموعۂ احادیث ''اربعین'' کے سلسلہ وار مطالعہ کے ضمن میں آج ہمارے زیر مطالعہ حدیث نمبر ۱۹ ہے۔ یہ حدیث روحِ دین کے اعتبار سے ایک بہت ہی اہم سرے سے بحث کرتی ہے —— اس کے راوی حضرت عبداللہ بن عباس ؓ ہیں' جن کی کنیت اَبُو الْعَبَّاس ہے۔ یعنی ان کے والد کا نام بھی عباس ہے اور ان کے بیٹے کا نام بھی عباس ہے —— اس حدیث کا لب لباب ہے: ''استعانت باللہ'' یعنی مدد مانگنی ہو تو صرف اللہ سے مانگو۔ یہ دین کی روح کا ایک بہت اہم مسئلہ ہے۔ میں نے اسی لیے شروع میں سورۃ الفاتحہ کی تلاوت کی تاکہ آپ کو اس مسئلے کی اہمیت کا اندازہ ہو جائے۔ سورۃ الفاتحہ جو ہماری نماز کا جزوِ لازم ہے' اس کے بارے میں حدیث نبوی ہے:

((لَا صَلَاۃَ لِمَنْ لَّمْ یَقْرَاْ بِفَاتِحَۃِ الْکِتَابِ)) (۱)

''جس نے سورۃ الفاتحہ نہیں پڑھی اس کی کوئی نماز نہیں ہے۔''

چنانچہ ہم ہر رکعت میں سورۃ الفاتحہ پڑھتے ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ فقہ حنفی کے مطابق نماز باجماعت میں صرف امام پڑھتا ہے اور امام کے پڑھنے سے گویا پوری جماعت کی طرف سے ادائیگی ہو جاتی ہے۔ بہرحال اس پر اتفاق ہے کہ سورۃ الفاتحہ ہی اصل نماز ہے۔

سورۃ الفاتحہ کے مضامین کا تجزیہ

صحیح مسلم کی ایک حدیث میں سورۃ الفاتحہ کے مضامین کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ یہ حدیث قدسی ہے اور حضرت ابوہریرہ ؓ سے مروی ہے۔ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: قَسَمْتُ الصَّلَاۃَ بَیْنِیْ وَبَیْنَ عَبْدِیْ نِصْفَیْنِ ''میں نے نماز کو اپنے اور اپنے بندے کے درمیان برابر برابر تقسیم کر دیا ہے'' —— اس کے بعد ساری تفصیل سورۃ الفاتحہ کے مضامین کی ہے۔ ہم نماز میں سورۃ الفاتحہ بھی پڑھتے ہیں اور اس کے بعد قرآن مجید کی کچھ اور آیات بھی پڑھتے ہیں۔ پھر نماز میں قیام بھی ہے' رکوع بھی ہے' سجود بھی ہے اور قعدہ بھی ہے۔ یہ سب کچھ ہے' لیکن اصل نماز سورۃ الفاتحہ ہے — چنانچہ اس حدیث میں اسی کا تجزیہ کیا گیا ہے۔

عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ ؓ قَالَ اِنِّیْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ یَقُوْلُ:

((قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی : قَسَمْتُ الصَّلَاۃَ بَیْنِیْ وَبَیْنَ عَبْدِیْ نِصْفَیْنِ وَلِعَبْدِیْ مَا سَاَلَ' فَاِذَا قَالَ الْعَبْدُ ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ﴾ قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی: حَمِدَنِیْ عَبْدِیْ' وَاِذَا قَالَ ﴿الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ﴾ قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی: اَثْنٰی عَلَیَّ عَبْدِیْ' وَاِذَا قَالَ ﴿مٰلِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ﴾ قَالَ مَجَّدَنِیْ عَبْدِیْ —— وَقَالَ مَرَّۃً: فَوَّضَ اِلَیَّ عَبْدِیْ —— فَاِذَا قَالَ ﴿اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَاِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ﴾ قَالَ ھٰذَا بَیْنِیْ وَبَیْنَ عَبْدِیْ وَلِعَبْدِیْ مَا سَاَلَ' فَاِذَا قَالَ ﴿اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ﴾ قَالَ ھٰذَا لِعَبْدِیْ وَلِعَبْدِیْ مَا سَاَلَ)) (۱)

حضرت ابوہریرہ ؓ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا:

''اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: میں نے نماز کو اپنے اور اپنے بندے کے درمیان دو برابر حصوں میں تقسیم کر دیا ہے (اس کا نصف حصہ میرے لیے اور نصف حصہ میرے بندے کے لیے ہے) اور میرے بندے کو وہ عطا کیا گیا جو اُس نے طلب کیا۔ جب بندہ کہتا ہے: ''اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ'' تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میرے بندے نے میری حمد کی (میرا شکر ادا کیا)۔ جب بندہ کہتا ہے: ''الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ'' تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میرے بندے نے میری ثنا کی۔ جب بندہ کہتا ہے: ''مٰلِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ'' تو اللہ فرماتا ہے کہ میرے بندے نے میری بزرگی اور بڑائی بیان کی —— اور ایک مرتبہ آپؐ نے یہ بھی فرمایا: ''میرے بندے نے اپنے آپ کو میرے سپرد کر دیا'' —— جب بندہ کہتا ہے: ''اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَاِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ'' تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ حصہ میرے اور میرے بندے کے مابین مشترک ہے اور میں نے اپنے بندے کو بخشا جو اُس نے مانگا۔ جب بندہ کہتا ہے:

(۱) صحیح البخاری' کتاب الاذان' باب وجوب القراءۃ للامام والمأموم فی الصلاۃ...... وصحیح مسلم' کتاب الصلاۃ' باب وجوب قراءۃ الفاتحۃ فی کل رکعۃ......

(۱) صحیح مسلم' کتاب الصلاۃ' باب وجوب قراءۃ الفاتحۃ فی کل رکعۃ......

''اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ'' تو اللہ فرماتا ہے کہ یہ حصہ (کُل کا کُل) میرے بندے کے لیے ہے اور میرے بندے نے جو کچھ مجھ سے طلب کیا وہ میں نے اُسے بخشا۔''

سورۃ الفاتحہ کا مرکزی مضمون: عبادت اور استعانت باللہ

سورۃ الفاتحہ میں کل سات آیات ہیں اور عجیب ترتیب ہے کہ تین آیات پر ایک جملہ بنتا ہے۔ دیکھئے: ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ○ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ○ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ○﴾ تین آیات ہیں اور یہ ایک جملہ ایک ہے۔ پھر آخری تین آیات ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ○ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۙ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ○﴾ بھی ایک جملہ ہیں۔ ان دونوں جملوں کے وسط میں ایک آیت ہے: ﴿اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ○﴾۔ یہ گویا ترازو کی ڈنڈی ہے اور درحقیقت یہ درمیانی آیت ہی سورۃ الفاتحہ کی مرکزی آیت ہے اور اس ایک آیت میں دو مکمل جملے ہیں۔ ﴿اِيَّاكَ نَعْبُدُ﴾ بھی مکمل جملہ ہے اور ﴿اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ﴾ بھی مکمل جملہ ہے اور درمیان میں ''واؤ'' گویا ترازو کی مٹھ کے مترادف ہے۔

اس مرکزی آیت میں دو اہم مضامین کا بیان ہے' ایک تو ہے: ﴿اِيَّاكَ نَعْبُدُ﴾ ''اے اللہ! ہم صرف تیری ہی بندگی کرتے ہیں اور کرتے رہیں گے''۔ یہ حال اور مستقبل دونوں کو محیط ہے۔ دوسری اہم بات ہے: ﴿اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ﴾ ''اے اللہ! ہم صرف تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں اور مانگتے رہیں گے''۔ گویا جو صلاۃ کا مرکزی نکتہ ہے وہی درحقیقت دین کا مرکزی نکتہ ہے۔ اربعین نووی کی حدیث ۳ کے مطالعہ کے دوران اس بات پر تفصیل سے گفتگو ہو چکی ہے کہ عبادت کا تصور کیا ہے جس کے لیے انسان کو پیدا کیا گیا ہے: ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ۝۵۶﴾ (الذّٰریٰت) ''اور میں نے جنّوں اور انسانوں کو بس اپنی عبادت ہی کے لیے پیدا کیا ہے''۔ اور تمام رسولوں کی دعوت کا مرکزی نکتہ بھی اللہ وحدہٗ لاشریک کی عبادت تھی اور ہر پیغمبر اپنی قوم کو یہی کہتا تھا: ﴿اَنْ لَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ﴾ (ھود:۲۶) ''کہ تم صرف اللہ کی عبادت کرو!'' شیخ

سعدی نے کہا تھا:

زندگی آمد برائے بندگی زندگی بے بندگی شرمندگی

پھر ہم نے اس میں کنفیوژن پیدا کر دیا کہ عبادت کو عبادات کے مترادف قرار دے دیا۔ نماز' روزہ' حج اور زکوٰۃ عبادات ہیں' لیکن وہ ''عبادت'' جس کے لیے ہمیں پیدا کیا گیا' وہ یہ چیزیں نہیں ہیں۔ عبادت تو یہ ہے کہ پوری زندگی میں ہمہ تن' ہمہ وقت' ہمہ جہت اللہ کی اطاعت کرنا' جبکہ نماز ہر وقت تو نہیں پڑھی جاتی اور روزہ ہر روز تو نہیں رکھا جاتا۔ لہٰذا عبادت سے مراد یہ عبادات نہیں ہو سکتیں۔ درحقیقت یہ عبادات اس عبادت کے لیے مددگار ہیں۔ اس کو ایک مثال سے یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ عبادت چھت کی مانند ہے اور یہ چار عبادات چھت کو مدد دینے والے ستون ہیں۔ ستونوں کی معنویت تب ہی ہو سکتی ہے جب ان کے اوپر ایک عمارت استوار ہو' ورنہ بغیر چھت کے چار ستون کھڑے کر دینا چہ معنی دارد! اسی طرح شامیانے کو سہارا دینے کے لیے بانس کھڑے کیے جاتے ہیں اور اگر شامیانہ ہی نہیں ہے تو پھر بانس کس کام کے؟

دُنیوی معاملات میں کسی سے مدد مانگنا

سورۃ الفاتحہ کی مرکزی آیت کا ایک مرکزی موضوع ''عبادت'' ہے' جبکہ اس کا دوسرا مرکزی موضوع ''استعانت باللہ'' ہے جو ہماری آج کی زیر مطالعہ حدیث میں بھی بیان ہوا ہے۔ اس ضمن میں آپ یہ سمجھ لیجیے کہ اللہ سے مدد مانگنے کے لیے مختلف الفاظ استعمال ہو سکتے ہیں۔ ایک ہے ''استعانت'' یہ لفظ اس حدیث میں بھی آیا ہے اور سورۃ الفاتحہ میں بھی۔ اسی طرح استمداد: مدد طلب کرنا' استنصار: نصرت مانگنا' استدعا: کسی کام کے لیے دعا کرنا' استغاثہ: کسی کی دہائی دینا۔ یہ تمام الفاظ ایک قبیل کے ہیں اور ان سب میں جامع لفظ ''استعانت'' ہے۔

استعانت ایک تو عام مادی دنیا کے امور کے اندر ہے' جیسے میں آپ سے کہوں: بھئی! مجھے پانی پلا دینا۔ اگرچہ یہ بھی ایک طرح کی استعانت ہی ہے کہ میں نے اپنی ایک ضرورت پورا کرنے کے لیے آپ سے مدد چاہی' لیکن اس میں کوئی شرک اور کوئی برائی

نہیں ہے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے بارے میں آتا ہے کہ آپؐ کبھی ایسے کام کے لیے بھی کسی کو نہیں کہتے تھے۔ یہاں تک کہ اگر آپؐ سواری پر ہوتے اور آپؐ کا کوڑا نیچے گر جاتا تو آپؐ اپنی سواری کو بٹھا کر یا سواری سے نیچے اُتر کر خود کوڑا اٹھاتے تھے‘ کسی سے کہتے نہیں تھے کہ ذرا اٹھا دو۔ یہ تو بڑے اونچے درجے کی بات ہے‘ لیکن عام حالات میں‘ مادی قوانین کے تحت اگر ہم کسی سے کوئی مدد چاہیں تو یہ کوئی بری بات نہیں ہے اور نہ ہی اس میں کوئی شرک ہے۔ اگرچہ بعض حضرات کے نزدیک اس کا بھی ایک درجہ ہے‘ وہ میں بعد میں بیان کروں گا۔

فرشتوں اور دیوی‘ دیوتاؤں سے مدد مانگنا

استعانت کے حوالے سے دوسری بات یہ ہے کہ ماورائی انداز میں کسی غیر مرئی حقیقی یا غیر مرئی موہومہ شخصیت سے مدد مانگنا صحیح نہیں ہے۔ غیر مرئی حقیقی سے مراد فرشتے اور غیر مرئی موہومہ سے مراد دیوی دیوتا (gods and godesses) ہیں جو لوگوں کے ذہن کی پیداوار ہیں۔ یہ سب غیر مرئی ہیں اور لوگوں نے ان کو پوجنے کے لیے ان کی تصویریں بنالی ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم نے یہ جو تصویریں‘ مجسمے اور بت بنائے ہیں یہ صرف توجہ کے ارتکاز کے لیے ہیں تاکہ ہم یکسوئی سے مراقبہ کر سکیں‘ ہمیں بھی پتا ہے کہ ان بتوں میں کچھ نہیں ہے۔ ایک عام جاہل دیہاتی بے چارہ یہی سمجھتا ہوگا کہ ان بتوں میں ہی سب کچھ ہے‘ یہی ہمارے معبود ہیں‘ لیکن جو پڑھے لکھے اور تعلیم یافتہ ہندو ہیں اُن کا عقیدہ یہی ہے کہ یہ بت کچھ کر سکنے کے قابل نہیں ہیں۔ بھارت کا سابقہ صدر ڈاکٹر رادھا کرشن جو بہت بڑا فلسفی تھا‘ اس کی دو ضخیم جلدوں پر مشتمل ایک کتاب ’’انڈین فلاسفی‘‘ ہے۔ اس میں اس نے لکھا ہے کہ ہم ان بتوں کو بااختیار نہیں سمجھتے‘ یہ تو صرف توجہ کو مرتکز کرنے (concentration) کے لیے ہم نے ان کو بنایا ہے تاکہ ان کے ساتھ ایک ذہنی اور روحانی رشتہ قائم کر کے گیان دھیان اور یک سوئی حاصل کر سکیں۔

بہرحال میں نے بتایا کہ غیر مرئی حقیقی اور غیر مرئی موہومہ سے مدد مانگنا صحیح نہیں ہے۔ غیر مرئی حقیقی میں فرشتے بھی ہیں۔ ہمیں معلوم ہے کہ ہمارے ساتھ ہر وقت کراماً

کاتبین موجود ہیں‘ لیکن میں ان سے یہ نہیں کہہ سکتا کہ ذرا میری یہ مشکل دور کر دو۔ یہ شرک ہو جائے گا۔ اسی طرح بہت سے فرشتے اس وقت ہمارے اس مجمع کو بھی گھیرے ہوئے ہیں۔ حضور ﷺ کی حدیث ہے:

((مَا اجْتَمَعَ قَوْمٌ فِیْ بَیْتٍ مِنْ بُیُوْتِ اللّٰہِ تَعَالٰی یَتْلُوْنَ کِتَابَ اللّٰہِ وَیَتَدَارَسُوْنَہٗ بَیْنَھُمْ اِلَّا نَزَلَتْ عَلَیْھِمُ السَّکِیْنَۃُ وَغَشِیَتْھُمُ الرَّحْمَۃُ وَحَفَّتْھُمُ الْمَلَائِکَۃُ وَذَکَرَھُمُ اللّٰہُ فِیْمَنْ عِنْدَہٗ)) (۱)

’’اللہ تعالیٰ کے گھروں میں سے کسی گھر میں جب بھی کچھ لوگ جمع ہوتے ہیں‘ قرآن کو پڑھنے پڑھانے اور سمجھنے سمجھانے کے لیے تو آسمان سے ان پر سکینت نازل ہوتی ہے‘ اور رحمت ان پر چھا جاتی ہے‘ اور فرشتے ان کے گرد گھیرا ڈال دیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ان کا ذکر اُن (یعنی ملائکہ مقربین) سے کرتا ہے جو اُس کے پاس ہیں۔‘‘

اللہ تعالیٰ فرشتوں سے فرماتا ہے کہ اے فرشتو! تم کہتے تھے نا کہ یہ آدم جس کو میں خلیفہ بنا رہا ہوں یہ دنیا میں فساد مچائے گا‘ دیکھو میرے بندے تو میرا ذکر کر رہے ہیں۔ بہرحال فرشتے موجود ہیں اور ان پر ہمارا ایمان بھی ہے‘ لیکن ان سے مدد نہیں مانگی جا سکتی۔

دیوی دیوتا: ایمان بالملائکہ کی بگڑی ہوئی شکل

اس ضمن میں نوٹ کرنے کی بات یہ ہے کہ اصل میں یہ جو دیوی دیوتا (gods and godesses) بنا لیے گئے ہیں یہ بھی ایمان بالملائکہ کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ملائکہ میں سے ہر ایک کو الگ الگ کام کے اوپر مامور کیا ہوا ہے۔ مثلاً کوئی پہاڑوں کا فرشتہ ہے‘ کوئی بارش کا فرشتہ ہے‘ مختلف فرشتوں کے ذمے مختلف کام ہیں۔ انہوں نے انہی فرشتوں کو اپنا دیوتا بنا لیا۔ اُن کو غلطی یہ لگی کہ انہوں نے سمجھ لیا کہ فرشتوں کو ان کاموں میں اختیار حاصل ہے‘ جبکہ ہمارا ایمان ہے کہ فرشتوں کو کوئی اختیار نہیں ہے۔ ان کے بارے میں قرآن مجید واضح طور پر فرما دیا گیا ہے: ﴿.....لَا یَعْصُوْنَ اللّٰہَ

(۱) سنن ابی داؤد‘ کتاب الصلاۃ‘ باب فی ثواب قراءۃ القرآن۔

مَآ اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ﴿۶﴾ (التحریم) ''.....(فرشتے) اللہ کے حکم کی نافرمانی نہیں کرتے اور وہ وہی کرتے ہیں جو انہیں حکم دیا جاتا ہے''۔ان کا اپنا کوئی اختیار نہیں ہے۔بس یہ باریک سا پردہ ہے جس سے صرفِ نظر کرنے سے ''ایمان بالملائکہ'' بگڑ کر دیویوں اور دیوتاؤں کی شکل اختیار کر گیا۔عرب کے لوگوں نے ان کو خدا کی بیٹیاں بنا ڈالا۔ان کے نام پر انہوں نے لات' منات اور عُزیٰ بنا ڈالے۔یہ سب مؤنث نام ہیں اور ان کے نزدیک یہ دیویاں اللہ کی بیٹیاں ہیں۔

اولیاء اللہ سے مدد مانگنا

غیر مرئی حقیقی کے بارے میں جو بات میں نے آپ کے سامنے ابھی بیان کی وہ متفق علیہ ہے کہ فرشتے موجود ہیں' مگر ان سے مدد نہیں مانگی جاسکتی۔اس بارے میں ایک بات مختلف فیہ ہے اور وہ یہ کہ غیر مرئی حقیقی میں فرشتوں کے ساتھ ساتھ اولیاء اللہ کی ارواح بھی شامل ہیں۔اگر امام الہند شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول نہ ہوتا تو میں کبھی اس کو تسلیم نہ کرتا کہ اللہ تعالیٰ اپنے بڑے محبوب بندوں کے انتقال کے بعد ان کی ارواح کو بھی فرشتوں کے درجہ اسفل یعنی سب سے نچلے درجے کے فرشتوں میں شامل کر لیتا ہے اور پھر وہ ارواح بھی اللہ کے احکام کی تنفیذ فرشتوں کی طرح کرتی ہیں۔اب یہ مختلف فیہ مسئلہ ہے' سب کے نزدیک متفقہ نہیں ہے' کیونکہ اس کے لیے ہمیں قرآن مجید سے کوئی دلیل نہیں ملتی۔لیکن شاہ ولی اللہ کہہ رہے ہیں تو ہم اسے یکسر نظر انداز بھی نہیں کر سکتے۔ اس اختلاف کے باوجود اس بات میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ ان کو بھی پکارا نہیں جائے گا اور ان سے مدد بھی طلب نہیں کی جائے گی۔وہ بے شک اللہ کی سول سروس کے اندر بھرتی ہو گئے' لیکن وہ بااختیار نہیں ہیں —— ہمارے ہاں بھی سول سروس کے کیڈرز (cadres) ہیں' جیسے ریونیو کے محکمے میں آپ پٹواری سے چلیں گے تو گرداور' اس سے اوپر نائب تحصیل دار' پھر تحصیل دار اور پھر اس سے اوپر کے عہدے ہیں۔اسی طرح فرشتوں کے بھی درجے ہیں: طبقہ اسفل' طبقہ اعلیٰ —— اگر اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں کی ارواح کو بھی اپنی سول سروس میں شامل کر دے تو ہمیں کیا اعتراض ہے اور اس کو ماننے

سے کوئی شرک لازم نہیں آئے گا۔البتہ اگر ہم انہیں پکاریں گے تو شرک لازم آجائے گا۔

یہ بہت نازک سا فرق ہے کہ ہم فرشتوں کو مانتے ہیں' مگر انہیں پکار نہیں سکتے' ان سے مدد نہیں مانگ سکتے۔اسی طرح اولیاء اللہ کی ارواح کے بارے میں خواہ آپ مانتے بھی ہوں کہ اللہ نے ان کو ملائکہ کی آخری صف میں بھرتی کر لیا ہے —— اور شیخ عبدالقادر جیلانیؒ اور دوسرے اولیاء اللہؒ کی ارواح اب بھی کہیں آ سکتی ہیں' روحِ محمدی (ﷺ) بھی آ سکتی ہے' لیکن ہم روحِ محمدی (ﷺ) یا اولیاء اللہؒ کی ارواح کو پکاریں گے نہیں۔ تو یہ ذرا باریک سا فرق ہے۔ہمارے ہاں اس فرق کو نہ سمجھنے کی وجہ سے یا تو بہت سے لوگ انکار کر دیتے ہیں کہ روح آ ہی نہیں سکتی' یا یہ کہ پھر ان سے دعائیں' استدعا' استغاثہ شروع کر دیتے ہیں۔تو یہ دونوں انتہائیں ہو جاتی ہیں۔

دنیوی کام میں مسلسل مدد مانگنا

میں نے قبل ازیں یہ بتایا تھا کہ مادی قوانین کے تحت دنیوی کاموں میں ایک دوسرے سے مدد مانگی جاسکتی ہے' لیکن اس کا بھی ایک درجہ ہے۔آپ نے دنیوی قوانین کے تحت کسی شخص سے ایک کام کہا۔فرض کیجیے' آپ کسی سے کہتے ہیں کہ فلاں جگہ پر میری سفارش کر دیجیے۔میرا یہ مسئلہ صد فیصد درست ہے' لیکن میرا مدّعا علیہ یا میرا مدّمقابل زیادہ چرب زبان ہے یا اس نے کوئی لمبی چوڑی سفارش فراہم کر لی ہے تو آپ بھی میری بات وہاں پر رکھ دیں —— اچھی شفاعت کے اندر اللہ تعالیٰ نے اجر و ثواب رکھا ہے' سورۃ النساء میں آیا ہے: ﴿مَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً يَّكُنْ لَّهٗ نَصِيْبٌ مِّنْهَا﴾ (آیت ۸۵) ''جو شخص نیک بات کی سفارش کرے تو اس کو اس (کے ثواب) میں سے حصہ ملے گا'' —— اب آپ کے ایک دفعہ کہنے پر اس نے آپ کا کام نہیں کیا' دوسری دفعہ کہنے پر بھی نہیں کیا' تیسری دفعہ آپ نے اسے پھر وہی کام کہا تو اس ضمن میں ایک بزرگ کا ایک قول میں آپ کو بتا رہا ہوں کہ اب یہ ایک درجے میں شرک ہو جائے گا۔ایک دو دفعہ تو ٹھیک ہے' لیکن اس پر اصرار کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے یہ یقین کر لیا ہے کہ آپ کی خیر اسی کے ہاتھ میں ہے اور یہ شرک خفی ہو جائے گا۔تو یہ باتیں بھی

سمجھنے کی ہیں۔بعض اوقات آدمی کسی کے پیچھے پڑ جاتا ہے اور مسلسل کہتا رہتا ہے‘ جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس کے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی ہے کہ اس کی بھلائی اسی شخص کے ہاتھ میں ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی چند نصیحتیں

اس تمہید کے بعد اب ہم حدیث کا مطالعہ کرتے ہیں۔حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: كُنْتُ خَلْفَ النَّبِيِّ ﷺ يَوْمًا ’’ایک دن میں نبی اکرم ﷺ کے پیچھے تھا‘‘۔ پیچھے ہونے سے کیا مراد ہے؟ گمانِ غالب ہے کہ سواری پر پیچھے بیٹھا تھا جس کو ردیف بھی کہتے ہیں‘ یا یہ بھی ہوسکتا ہے کہ چلتے ہوئے پیچھے پیچھے چل رہے ہوں۔اس کیفیت میں حضور ﷺ نے ان سے فرمایا: ((يَا غُلَامُ! اِنِّيْ اُعَلِّمُكَ كَلِمَاتٍ)) ’’اے لڑکے! میں تمہیں چند کلمات کی تلقین کرتا ہوں (یعنی چند نصیحتیں کرتا ہوں)‘‘۔ یہ حضور ﷺ کا طریقہ تربیت اور تعلیم وتزکیہ تھا۔وہاں کوئی مدرسے نہیں تھے‘ وہاں کوئی درس وتدریس کی محفلیں نہیں ہوتی تھیں۔محفل تو ہفتہ میں ایک ہی ہوتی تھی اور وہ جمعہ کا اجتماع ہوتا تھا۔باقی حضور ﷺ کی صحبت ہے‘ فجر کی نماز کے بعد آپؐ بیٹھے ہیں تو صحابہ بھی بیٹھ گئے‘ کچھ گفتگو ہو رہی ہے۔اسی میں تربیت‘ اسی میں تعلیم اور اسی میں تزکیہ ہوتا تھا۔ ضربیں مارنے کے لیے علیحدہ قسم کے حلقے نہیں ہوتے تھے۔ یہ تو سب مانتے ہیں کہیہ بہت بعد کی ایجاد ہے‘ اس لیے یہ مسنون نہیں ہیں۔بہرحال حضور ﷺ نے فرمایا: اے نوجوان‘ اے لڑکے‘ اے بیٹے! (حضرت ابن عباسؓ رسول اللہ ﷺ کے چچا زاد بھائی ہیں اور عمر میں بہت چھوٹے ہیں‘ اسی لیے آپؐ نے انہیں يَا غُلَامُ! سے خطاب فرمایا۔) میں تمہیں چند باتیں سکھاتا ہوں‘ توجہ اور غور سے سنو اور انہیں حرزِ جان بنالو!

پہلی نصیحت: پہلی بات آپ ﷺ نے یہ فرمائی: ((اِحْفَظِ اللّٰهَ يَحْفَظْكَ)) ’’اللہ کی حفاظت کرو‘ وہ تمہاری حفاظت کرے گا‘‘۔اللہ کی حفاظت سے کیا مراد ہے؟ عام طور پر یہ سمجھا گیا ہے کہ اللہ کے احکام کی حفاظت کرو‘ بایں طور کہ اللہ کا کوئی حکم ٹوٹنے نہ

پائے‘ اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ وہ تمہاری حفاظت کرے گا۔اس کا ایک مفہوم یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اللہ کو اپنے دل میں محفوظ رکھو‘ یعنی اس کی یاد اور ذکر سے خانہ قلب کو خالی نہ ہونے دو تو اللہ تعالیٰ تمہاری حفاظت کرے گا اور تمہیں یاد رکھے گا۔جیسے سورۃ البقرۃ میں ارشاد فرمایا: ﴿فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ﴾ (آیت ۱۵۲) ’’پس تم مجھے یاد رکھو‘ میں تمہیں یاد رکھوں گا‘‘۔حدیث قدسی میں بھی یہ الفاظ آئے ہیں۔رسول اللہ ﷺ بیان کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

((أَنَا عِنْدَ ظَنِّ عَبْدِي بِيْ وَأَنَا مَعَهُ حِيْنَ يَذْكُرُنِيْ، فَإِنْ ذَكَرَنِيْ فِي نَفْسِهٖ ذَكَرْتُهُ فِيْ نَفْسِيْ، وَإِنْ ذَكَرَنِيْ فِيْ مَلَإٍ ذَكَرْتُهُ فِيْ مَلَإٍ خَيْرٍ مِنْهُمْ)) (۱)

’’میں اپنے بندے کے گمان کے ساتھ ہوں۔جب وہ مجھے یاد کرتا ہے میں اس کے ساتھ ہوتا ہوں۔اگر وہ مجھے اپنے دل میں یاد کرتا ہے تو میں بھی اسے اپنے دل میں یاد کرتا ہوں اور اگر وہ مجھے کسی جماعت میں یاد کرتا ہے تو میں اس سے بہتر جماعت کے سامنے اسے یاد کرتا ہوں۔‘‘

اللہ تعالیٰ کی محفل ملاء اعلیٰ میں ملائکہ مقربین کی ہے۔امیر خسروؒ نے پتا نہیں کس کیفیت میں یہ شعر کہا ہے:؎

خدا خود میرِ محفل بود اندر لا مکاں خسرو
محمدؐ شمعِ محفل بود شب جائے کہ من بودم

یعنی رات میں جہاں تھا وہ تو لامکاں کی محفل تھی اور اس محفل میں میرِ محفل اللہ تعالیٰ تھا اور شمعِ محفل محمدؐ رسول اللہ ﷺ تھے۔بہرحال اللہ کو تم اپنے دل میں مستحضر رکھو تو اللہ تعالیٰ تمہیں بھی یاد رکھے گا۔

ذکر اللہ کے معنی ہی استحضار اللّٰہ فی القلب (اللہ کو دل میں حاضر کرنا) ہیں اور جنہیں ہم ذکر سمجھ بیٹھے ہیں وہ تو ذکر کے ذریعے ہیں۔جیسے نماز کے بارے میں فرمایا گیا: ﴿وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ ۝۱۴﴾ (طٰہٰ) ’’اور نماز قائم کرو میری یاد کے لیے‘‘۔چنانچہ

(۱) سنن الترمذی‘ ابواب الدعوات‘ باب فی حسن الظن باللہ عزوجل۔

نماز ذکرِ الٰہی کا ذریعہ ہے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ آپ نے عشاء کی سترہ رکعتیں بھی پڑھ لی ہوں اور رب کی یاد آپ کو پھر بھی نہ آئی ہو۔ اس کا مطلب تو یہ ہے کہ آپ ایک مکینیکل انداز میں اُٹھک بیٹھک کر رہے ہیں اور آپ کی زبان سے (ٹیپ ریکارڈر کے انداز میں) نماز کے الفاظ نکل رہے ہیں' لیکن آپ کے شعور اور دل کی گہرائی سے ان کا کوئی رابطہ ہے ہی نہیں۔ وہ ذکر تو نہیں ہوا' ہاں نماز فرض تھی تو آپ کا فرض ادا ہو گیا۔ لہٰذا جنہیں ہم نے ذکر سمجھ لیا ہے وہ تو ذکر کے ذرائع ہیں۔ زبان سے اللہ اللہ' سبحان اللہ سبحان اللہ کرنا اس لیے ہے تاکہ اس کے نتیجے میں ذکر حاصل ہو جائے۔

دوسری نصیحت: رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابن عباسؓ کو دوسری نصیحت یہ فرمائی: ((اِحْفَظِ اللّٰهَ تَجِدْهُ تُجَاهَكَ)) ''اللہ کو یاد رکھو تو اُسے اپنے سامنے موجود پاؤ گے۔''

زیرِ مطالعہ حدیث کے حوالے سے یہ یاد رکھیے کہ اس حدیث کو بہت سے محدثین نے نقل کیا ہے۔ یہ متن جس کا ہم مطالعہ کر رہے ہیں یہ امام ترمذی کی نقل کردہ روایت کا ہے اور ان کا قول ہے کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ اس متن کے علاوہ ایک اور متن بھی امام نوویؒ نے اپنی ''اربعین'' میں درج کیا ہے اور اُس دوسرے متن میں بیان کی گئی پہلی بات وہی ہے جو یہاں بیان ہوئی ہے' بس ایک لفظ کا فرق ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ((اِحْفَظِ اللّٰهَ تَجِدْهُ اَمَامَكَ)) ''تو اللہ (کے احکام) کی حفاظت کر پس تو اسے اپنے سامنے پائے گا'' —— وہاں تُجَاهَكَ تھا' یہاں اَمَامَكَ ہے۔ مطلب ایک ہی ہے: ''اپنے سامنے'' —— یعنی وہ تو دل میں ہے' جب چاہو اس سے مخاطب ہو جاؤ' جب چاہو اس سے دعا کرو اور جب چاہو اُس سے مانگو۔ جیسے کسی نے کیا خوب کہا ہے: ؎

دل کے آئینے میں ہے تصویرِ یار
جب ذرا گردن جھکائی دیکھ لی!

چنانچہ سورۂ قٓ میں فرمایا گیا: ﴿وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ ۝۱۶﴾ ''اور ہم تو اس کی رگِ جان سے بھی زیادہ قریب ہیں''۔ یعنی اللہ تو تمہارے دل میں موجود ہے' لہٰذا تم اپنے دل میں اسے تلاش کرو۔ وہ جو بیدل نے کہا ہے: ؎

ستم است گر ہوست کشد کہ بہ سیرِ سرو و سمن درآ
تو ز غنچہ کم نہ دمیدۂ درِ دل کشا بہ چمن درآ!

یعنی بڑے ستم کی بات ہے کہ تم اپنی خواہش پوری کرنے کی خاطر باغیچے میں جاؤ اور پھولوں کی سیر کرو' یہ گلاب کا پھول ہے' یہ موتیا ہے۔ تم خود کسی غنچے سے کم باصلاحیت نہیں ہو' تم تو خود ایک پھول ہو' اللہ کا بنایا ہوا اشرف المخلوقات پھول۔ تم اپنے دل کا دروازہ کھولو اور اس کے اندر جو چمن آباد ہے اس کی سیر کرو! وہ کیا ہے؟ وہ روح ہے۔ قلب مسکن ہے روح کا!

تیسری نصیحت: رسول اللہ ﷺ نے تیسری بات یہ فرمائی: ((اِذَا سَاَلْتَ فَاسْاَلِ اللّٰهَ)) ''جب مانگو تو اللہ سے مانگو''۔ غیر اللہ کے سامنے دستِ سوال مت دراز کرو۔ دنیوی قواعد و قوانین کے تحت کسی سے مدد مانگنا یا مدد چاہنا حرام نہیں ہے' البتہ یہ ضرور ہے کہ اگر آپ اس پر اصرار کریں گے تو اس میں شرک کی بدبو پیدا ہو جائے گی۔ لیکن عام حالات میں باہم سوال کرنے اور مدد کرنے پر دنیا قائم ہے۔ ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کے ساتھ ہی یہ دنیا چل رہی ہے' لیکن اونچا مقام یہ ہے کہ سوائے اللہ کے کسی سے سوال مت کیا جائے۔ یہاں تک کہ جوتے باندھنے کا تسمہ بھی اگر آپ کو درکار ہے تو وہ بھی اللہ سے مانگو۔ کیا پتا اللہ تعالیٰ کسی کے دل میں ڈال دے اور وہ آ کر تمہیں تسمہ پیش کر دے۔ جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ لو لگا کر رکھنے والے ہیں ان کے ساتھ بسا اوقات ایسے واقعات پیش آتے ہیں کہ دل میں ایک بات آئی اور اسی وقت کسی شخص نے آ کر وہ بات پوری کر دی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لوگوں کے دل اللہ کی دو انگلیوں کے مابین ہیں' وہ جب چاہتا ہے پھیر دیتا ہے۔ کیا پتا اللہ تعالیٰ کسی فرشتے کو انسانی شکل میں بھیج دے جو آپ کی تکلیف کو رفع کر دے یا آپ کی ضرورت کو پورا کر دے۔ لہٰذا اُسی سے مانگو' کسی اور سے مت مانگو۔ یہی توحید کا لُبِّ لُباب ہے۔

چوتھی نصیحت: اگلی بات آپ ﷺ نے یہ فرمائی: ((وَاِذَا اسْتَعَنْتَ فَاسْتَعِنْ بِاللّٰهِ)) ''اور جب مدد مانگو تو صرف اللہ سے مانگو''۔ استعانت میں وہ سارے الفاظ

آ جائیں گے جو میں نے ابتدا میں بیان کیے۔ لہٰذا استمداد‘ استعانت‘ استدعا‘ استغاثہ یہ سب صرف اور صرف اللہ سے ہو۔

اسلام کی جڑ ایمان ہے۔ یعنی اسلام کا جو خارجی نظامِ عمل ہے‘ چاہے انفرادی اعمال ہوں یا اجتماعی‘ ان سب کی روحِ رواں ایمان ہے‘ اور ایمان کا خلاصہ اور لُبِّ لُباب ایمان باللہ ہے۔ ویسے تو ایمان میں ایمان باللہ‘ ایمان بالآخرۃ‘ ایمان بالملائکہ‘ ایمان بالرسل‘ ایمان بالکتب اور ایمان بالقدر شامل ہے‘ لیکن ایمان کا لُبِّ لُباب اور روح ’’ایمان باللہ‘‘ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ’’ایمانِ مجمل‘‘ میں سوائے ایمان باللہ کے اور کسی چیز کا ذکر نہیں ہے۔

آمَنْتُ بِاللّٰهِ كَمَا هُوَ بِاَسْمَائِهٖ وَصِفَاتِهٖ وَقَبِلْتُ جَمِيْعَ اَحْكَامِهٖ اِقْرَارٌ بِاللِّسَانِ وَتَصْدِيْقٌ بِالْقَلْبِ

یہ ’’ایمانِ مجمل‘‘ ہے‘ یعنی اجمالی طور پر ایمان اس کا نام ہے۔ ہاں ’’ایمانِ مفصل‘‘ یعنی تفصیلی طور پر ایمان یہ ہے:

آمَنْتُ بِاللّٰهِ وَمَلَائِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْقَدْرِ خَيْرِهٖ وَشَرِّهٖ مِنَ اللّٰهِ تَعَالٰى وَالْبَعْثِ بَعْدَ الْمَوْتِ

الغرض اسلام کا سارا نظامِ عمل‘ چاہے انفرادی اعمال ہوں یا اجتماعی‘ ان سب کی روحِ رواں ایمان ہے اور ایمان کا خلاصہ ہے ایمان باللہ۔ اور پھر ایمان باللہ کا اصل حاصل وہ ہے جو زیرِ مطالعہ حدیث میں آ رہا ہے۔ یعنی ایمان باللہ کے دو تقاضے ہیں: (i) عبادت صرف اللہ کی‘ اور (ii) استعانت صرف اسی سے۔

پانچویں نصیحت: زیرِ مطالعہ حدیث کے دوسرے متن میں ان چار باتوں کے علاوہ ایک اور اہم بات کا تذکرہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((تَعَرَّفْ اِلَى اللّٰهِ فِي الرَّخَاءِ يَعْرِفْكَ فِي الشِّدَّةِ)) ’’کشادگی کے وقت میں تم اللہ کو یاد رکھو تو وہ تنگی کے وقت تمہیں یاد رکھے گا‘‘۔ یعنی تمہاری کسمپرسی کی حالت میں تمہاری مدد فرمائے گا۔ ویسے تو ہر حالت میں اللہ کو یاد رکھنا چاہیے‘ لیکن رسول اللہ ﷺ نے خصوصی طور پر کشادگی اور

خوشحالی کے اوقات میں اللہ کو یاد کرنے کی تلقین فرمائی۔ اس بارے میں بہادر شاہ ظفر کے اشعار میں سے بہت زبردست شعر ہے:

ظفرؔ آدمی اُس کو نہ جانیے گا‘ ہو وہ کتنا ہی صاحبِ فہم و ذکا
جسے عیش میں یادِ خدا نہ رہی‘ جسے طیش میں خوفِ خدا نہ رہا!

لہٰذا کشادگی کی حالت میں اللہ کی طرف رجوع کیے رکھنا چاہیے۔ اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ جب تمہیں کوئی تکلیف ہوگی تو وہ تکلیف کو تم پر آسان کر دے گا۔ اگر کوئی تکلیف تمہارے مقدر میں لکھ دی گئی ہے تو وہ آ کر رہے گی‘ لیکن اللہ تعالیٰ اس کی شدت کو کم کر دے گا۔ ایک ہی چیز ہے جس کو ایک انسان بہت شدت کے ساتھ محسوس کر رہا ہے اور دوسرا اس تکلیف کو اتنی شدت سے محسوس نہیں کر رہا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس دوسرے شخص کے لیے اس تکلیف کی شدت میں کمی کر دی ہے۔

نفع و نقصان کا مالک صرف اللہ ہے!

زیرِ مطالعہ حدیث کا آخری ٹکڑا تقدیر سے متعلق ہے‘ جبکہ تقدیر کا تفصیلی بیان حدیث ۴ کے مطالعہ میں بھی گزر چکا ہے۔ حدیث ۴ بہت عظیم حدیث ہے اور اس کے مطالعے میں ہم نے کئی خطاباتِ جمعہ صرف کیے تھے۔ اس حدیث کی ابتدا میں انسان کی حقیقت کا بیان ہے اور آخر میں ایمان بالقدر کا تذکرہ ہے۔ جبکہ زیرِ مطالعہ حدیث میں تقدیر کا موضوع دوبارہ آ رہا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابن عباسؓ سے فرمایا: اے میرے بیٹے‘ میرے بچے‘ اے عزیز! ((اِعْلَمْ اَنَّ الْاُمَّةَ لَوِ اجْتَمَعَتْ عَلٰى اَنْ يَّنْفَعُوْكَ بِشَيْءٍ لَمْ يَنْفَعُوْكَ اِلَّا بِشَيْءٍ قَدْ كَتَبَهُ اللّٰهُ لَكَ)) ’’جان لو! اگر سب لوگ جمع ہو کر تمہیں کسی شے کا نفع اور فائدہ پہنچانا چاہیں تو وہ تمہیں کچھ نفع نہیں پہنچا سکتے مگر وہی جو تمہارے لیے اللہ نے لکھ دیا ہے‘‘۔ جب اللہ کا یہ فیصلہ ہے کہ انسان کو اُس کی تقدیر کے مطابق ہی ملے گا تو پھر غیر اللہ سے مانگنا تو فعل عبث ہو گیا‘ اس لیے کہ ان کے ہاتھ میں تو کچھ ہے ہی نہیں۔ لہٰذا یہ جان لو‘ اس بات پر یقین کر لو کہ اگر دنیا کے سب لوگ مل کر یہ چاہیں کہ تمہیں کوئی نفع پہنچا دیں تو وہ تمہیں کسی طرح کا بھی نفع نہیں پہنچا سکتے سوائے اس

کے جو اللہ نے تمہارے لیے لکھ دیا ہے۔

آپ اندازہ کیجیے کہ جس شخص کا یقین اس سطح کا ہو تو اس میں کتنا اِستغناء ہوگا۔ پھر وہ کسی کے سامنے پیشانی نہیں رگڑے گا‘ ہاتھ نہیں پھیلائے گا‘ اپنی عزتِ نفس کو ہتھیلی پر رکھ کر پیش نہیں کرے گا۔ صاف ظاہر ہے کہ اگر آپ نے کسی سے سوال کیا تو آپ نے اپنی عزتِ نفس اس کے سامنے پیش کر دی۔ اب وہ چاہے تو اس کا کچھ لحاظ کر لے‘ چاہے تو آپ کی عزتِ نفس کو ٹھوکر مار دے۔ لہٰذا جب بھی مانگو تو صرف اللہ سے مانگو اور مدد بھی صرف اسی سے طلب کرو‘ اس لیے کہ نفع پہنچانے کا مالک صرف اور صرف اللہ ہے‘ جبکہ تمام لوگ مل کر بھی تمہیں وہ نفع نہیں پہنچا سکتے جو اللہ نے تمہارے مقدر میں لکھا ہی نہیں۔

آگے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((وَاِنِ اجْتَمَعُوْا عَلٰی اَنْ یَّضُرُّوْكَ بِشَیْءٍ لَمْ یَضُرُّوْكَ اِلَّا بِشَیْءٍ قَدْ كَتَبَهُ اللّٰهُ عَلَیْكَ)) ’’اور اگر سب مل کر چاہیں کہ تمہیں کوئی نقصان پہنچا دیں تو وہ تمہیں کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتے مگر اتنا ہی جو اللہ نے تمہارے لیے لکھ دیا ہے‘‘۔ اگر انسان میں اس بات کا یقین پیدا ہو جائے تو پھر خوف کی جڑ کٹ جائے گی‘ اس لیے کہ یہ خوف اور حزن دونوں سے نجات دلانے والی شے ہے۔ جو حقیقی مؤمن ہے وہ اللہ کا ولی ہے اور اولیاء اللہ کے بارے میں اللہ تعالیٰ خود فرماتا ہے: ﴿اَلَآ اِنَّ اَوْلِیَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ﴿۶۲﴾﴾ (یونس) ’’سن رکھو کہ جو اللہ کے دوست ہیں ان کو نہ کچھ خوف ہوگا اور نہ وہ غمناک ہوں گے۔‘‘

جان لیجیے کہ اولیاء اللہ کوئی علیحدہ مخلوق نہیں ہے‘ ان کے سر پر سینگ نہیں ہوتے۔ یہ بھی انسان ہی ہوتے ہیں‘ لیکن عام لوگوں سے ان کا فرق یہ ہے کہ یہ حقیقی مؤمن ہوتے ہیں۔ ان اعتبارات سے‘ جو آج ہم پڑھ رہے ہیں‘ اگر کسی شخص کا ایمان اس درجے کو پہنچ گیا ہے تو وہ اللہ کا ولی ہے اور اسے کسی بات کا خوف نہیں ہوگا۔ اس لیے کہ اسے یہ یقین ہوگا کہ کسی کے ہاتھ میں میرے نفع وضرر کا کوئی اختیار ہے ہی نہیں‘ اگر اللہ نے میرے لیے کچھ نقصان لکھ دیا ہے تو وہ ہو کر رہے گا۔ میں کسی کی لاکھ منت سماجت کروں‘ جو اللہ نے میرے لیے لکھ دیا ہے تو وہ آ کر رہے گا۔ لہٰذا کاہے کو میں کسی کے سامنے گڑگڑاؤں‘ کاہے کو کسی کے سامنے جگ ہنسائی کراؤں۔ اسی طرح اگر کسی کے ہاتھ میں میرا خیر ہے ہی نہیں تو کاہے کو میں اس کی خوشامد کروں!

حدیث کے آخر میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((رُفِعَتِ الْاَقْلَامُ وَجَفَّتِ الصُّحُفُ)) ’’(دیکھو نوجوان!) قلمیں اٹھا لی گئی ہیں اور صحیفوں (کی سیاہی) خشک ہو چکی ہے‘‘۔ یہ ہے اللہ کا وہ علم قدیم جس میں ہر شے لکھ دی گئی ہے اور اس کے قلم اٹھا لیے گئے ہیں۔ جیسے آپ کو معلوم ہے کہ تین گھنٹے کا امتحان ہوتا ہے اور وقت ختم ہوتے ہی امتحان گاہ میں ممتحن کی آواز گونجتی ہے: "stop writing!" تو اس پر قلم رک جاتے ہیں۔ اسی طرح تقدیر لکھنے والا قلم بھی اب اٹھا لیا گیا ہے اور جن صحیفوں پر تقدیر لکھی گئی ہے وہ خشک بھی ہو گئے ہیں۔ اب ان میں کسی قسم کا کوئی ردّوبدل نہیں ہو سکتا۔

ملے گا وہی جو تقدیر میں لکھ دیا گیا ہے!

زیر مطالعہ حدیث کے دوسرے متن کے چند جملوں کا تذکرہ پہلے متن کے ضمن میں ہو چکا ہے‘ جبکہ باقی متن کا بیان ذیل میں کیا جاتا ہے —— رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((وَاعْلَمْ اَنَّ مَا اَخْطَاَكَ لَمْ یَكُنْ لِیُصِیْبَكَ)) ’’اور جان لو کہ جو چیز تم سے چھوٹ گئی ہے وہ ہرگز تمہیں ملنے والی نہیں تھی‘‘۔ مثلاً آپ نے کسی ملازمت کے لیے درخواست دی تھی۔ آپ نے اپنی سی محنت کر لی‘ لیکن وہ ملازمت آپ کو نہیں ملی۔ اب آپ افسوس‘ رنج اور غم میں بیٹھے ہوئے ہیں سوچ رہے ہیں کہ فلاں نے یہ کر دیا تھا‘ فلاں بڑی تگڑی سفارش لے آیا تھا‘ فلاں نے رشوت دے دی تھی‘ وغیرہ وغیرہ۔ چھوڑو میاں! ان سب سوچوں کو‘ بس یہ یقین کر لو کہ وہ نوکری تمہارے لیے تھی ہی نہیں۔ کاہے کو اپنے ذہن کے اندر یہ کھچڑی پکا کر خواہ مخواہ سوءِ ظن میں مبتلا ہو رہے ہو؟ کسی نے رشوت نہ دی ہو اور آپ سمجھتے ہیں کہ اس نے رشوت دی ہے‘ تو یہ سوءِ ظن ہو گیا اور سورۃ الحجرات میں سوءِ ظن کو گناہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ فرمایا:

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِیْرًا مِّنَ الظَّنِّ ۫ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ﴾ (آیت ۱۲)

’’اے اہل ایمان! بہت زیادہ گمان کرنے سے بچو‘ اس لیے کہ بعض گمان گناہ

ہوتے ہیں۔‘‘

آگے آپ ﷺ نے فرمایا: ((وَمَا اَصَابَكَ لَمْ يَكُنْ لِيُخْطِئَكَ)) ’’اور جو تکلیف تم پر آ گئی ہے وہ کبھی بھی تم سے چوکنے والی نہیں تھی‘‘۔ یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ وہ تم پر نہ آتی۔ انسان سوچتا ہے کہ میں یہ کر لیتا تو شاید ایسا ہو جاتا‘ میں نے ٹیکا پہلے لگوا لیا ہوتا تو بیماری اس انتہا تک نہ پہنچتی۔ بھئی جو ہونا تھا وہ ہونا ہی تھا۔ یہ وہ چیز ہے جس سے انسان میں تسلیم و رضا پیدا ہوتی ہے۔ ؎

ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے
بے نیازی تیری عادت ہی سہی!

اے اللہ! جو تو نے چاہا وہ مجھے بہر صورت قبول ہے۔ اسی لیے میں نے شروع میں سورۃ التغابن کی یہ آیت تلاوت کی تھی:

﴿مَا اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ وَمَنْ يُّؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ يَهْدِ قَلْبَهٗ ۭ﴾

’’کوئی مصیبت نہیں آتی مگر اللہ کے اذن سے‘ اور جو اللہ پر ایمان رکھتا ہے تو اللہ اس کے دل کو ہدایت دے دیتا ہے۔‘‘

اس ہدایت سے مراد ہے تسلیم و رضا: ؎

نہ شود نصیب دشمن کہ شود ہلاکِ تیغت
سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی!

اے اللہ! تیری طرف سے آنے والی ہر مشکل مجھے قبول ہے۔ بظاہر اس سے مجھے تکلیف ہو رہی ہے‘ لیکن یقیناً اس میں میری کوئی بھلائی ہے۔ اسی لیے تو فرمایا گیا: ﴿بِيَدِكَ الْخَيْرُ﴾ (آلِ عمران:۲۶) ’’(اے اللہ!) تیرے ہاتھ میں تو خیر ہی خیر ہے۔‘‘

یہ مضمون سورۃ الحدید (آیت ۲۲‘۲۳) میں زیادہ بڑے پیمانے پر آیا ہے۔ وہاں فرمایا گیا: ﴿مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ﴾ ’’کوئی مصیبت نہیں آتی نہ زمین میں اور نہ تمہاری جانوں میں‘‘۔ مثلاً زمین میں زلزلہ آ جانا‘ سیلاب آ جانا‘ یا زمین کا دھنس جانا۔ اسی طرح کسی کو کوئی بخار ہو گیا‘ کوئی اور تکلیف ہو گئی‘ اچانک

معلوم ہوا کہ ان صاحب کو کینسر ہے اور کینسر بھی اب تیسری سٹیج پر پہنچ چکا ہے۔ یہ سب کچھ اللہ کے علم قدیم میں پہلے سے لکھا ہوا ہے۔ ﴿اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا ۭ﴾ ’’مگر ایک کتاب میں درج ہے اس سے پہلے کہ ہم اسے ظاہر کریں‘‘۔ اس کا نتیجہ یہ نکلنا چاہیے: ﴿لِّكَيْلَا تَاْسَوْا عَلٰي مَا فَاتَكُمْ﴾ ’’تاکہ تم افسوس نہ کرو اُس پر جو تم سے جاتا رہے‘‘۔ کوئی عزیز فوت ہو گیا یا کوئی مالی نقصان ہو گیا تو اس پر افسوس مت کرو۔ ﴿وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰىكُمْ ۭ﴾ ’’اور جو اللہ تمہیں دے دے اس پر مت اتراؤ۔‘‘

صبر اور مدد‘ تنگی اور کشادگی‘ مشکل اور آسانی ساتھ ساتھ ہیں!

زیر مطالعہ حدیث کے آخر میں رسول اللہ ﷺ نے تین اہم حقیقتیں بیان فرمائیں۔

پہلی حقیقت آپ ﷺ نے یہ بیان فرمائی: ((وَاعْلَمْ اَنَّ النَّصْرَ مَعَ الصَّبْرِ)) ’’اور جان لو! اللہ کی مدد صبر کے ساتھ آتی ہے‘‘۔ جو بھی اللہ وحدہٗ لاشریک کی طرف سے آئے اسے اس طور سے جھیلو کہ زبان پر کوئی بھی کلمۂ شکوہ و شکایت نہ آئے۔ مولانا محمد علی جوہر ایک مرتبہ جیل میں گئے تو اُن کی ایک بیٹی بیمار ہوئی اور فوت ہو گئی۔ اس کے بعد دوسری مرتبہ جیل میں گئے تو دوسری بیٹی کو بھی وہی بیماری لگ گئی۔ جیل میں اطلاع ملی تو اشعار کی شکل میں خط لکھا۔ اس کا آخری شعر یہ ہے: ؎

تیری صحت ہمیں منظور ہے لیکن
اُس کو نہیں منظور تو پھر ہم کو بھی نہیں منظور

یعنی اے بیٹی! ہم تو چاہتے ہیں کہ تجھے شفا ہو جائے‘ لیکن اگر اللہ تعالیٰ کو یہ منظور نہیں تو ہمیں بھی منظور نہیں۔ ع ’’سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے!‘‘

دوسری حقیقت رسول اللہ ﷺ نے یہ بیان فرمائی: ((وَاَنَّ الْفَرَجَ مَعَ الْكَرْبِ)) ’’اور تکالیف و مصائب کے بعد کشادگی اور فراخی آتی ہے‘‘۔ فرج کے معنی ہیں: کسی چیز کا کھل جانا‘ کشادگی ہو جانا۔ یہ کشادگی‘ کرب اور تکلیف کے ساتھ وابستہ ہے اور یہی اللہ نے دنیا کا قانون بنایا ہے۔ آپ اندازہ کیجیے کہ بچے کی ولادت میں ماں کو کتنی تکلیف اٹھانی پڑتی ہے‘ لیکن جیسے ہی بچے کو لا کر ماں کے برابر لٹایا جاتا ہے تو ماں کی ساری تکلیف

ختم ہو جاتی ہے اور اُسے ایک عظیم راحت میسر آ جاتی ہے۔

تیسری حقیقت آپ ﷺ نے یہ بیان فرمائی: ((وَاَنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا)) ''اور مشکل کے بعد آسانی ہوتی ہے''۔ اسی لیے میں نے سورۃ الانشراح کی دو آیات بھی پڑھی تھیں: ﴿فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۝ اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا﴾ ''(سن لو!) مشکل کے ساتھ آسانی بھی ہے (اور) بے شک مشکل کے ساتھ آسانی بھی ہے''۔ اس دنیا میں اللہ تعالیٰ نے ایسا نظام بنایا ہے کہ سختیاں جھیلنی ہی پڑتی ہیں۔ اسی لیے فرمایا گیا: ﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْ كَبَدٍ﴾ (البلد) ''ہم نے انسان کو مشقت کے اندر پیدا کیا ہے''۔ لہٰذا مشقت تو کرنی پڑے گی' اس سے کسی کو مفر نہیں ہے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ کسی کی جسمانی مشقت زیادہ ہے اور کسی کی ذہنی مشقت زیادہ ہے۔

آخر میں دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اس حدیث کے مندرجات پر اس کی روح کے مطابق عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین یا ربّ العالمین!

اقول قولی هذا واستغفر اللّٰه لی ولکم ولسائر المُسلمین والمُسلمات

(مرتب: حافظ محمد زاہد' ادارتی معاون)

بقیہ: تصورِ توحید کی نعمت

اس آیت میں اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ کی معنویت سمجھنے کے لیے یہ نقشہ ذہن میں لائیے کہ اوپر کا سوال لوگوں کے سامنے پیش کرنے کے بعد مقرر نے سکوت کیا' تاکہ اگر مخالفینِ توحید کے پاس اس کا کوئی جواب ہو تو دیں۔ پھر جب ان سے کوئی جواب نہ بن پڑا اور کسی طرف سے یہ آواز نہ آئی کہ دونوں برابر ہیں' تو مقرر نے کہا اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ۔ یعنی خدا کا شکر ہے کہ تم خود بھی اپنے دلوں میں ان دونوں حالتوں کا فرق محسوس کرتے ہو اور تم میں سے کوئی بھی یہ کہنے کی جرأت نہیں رکھتا کہ ایک آقا کی بندگی سے بہت سے آقاؤں کی بندگی بہتر ہے یا دونوں یکساں ہیں۔

بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ سے مراد یہ ہے کہ اکثر لوگ ایک آقا کی غلامی اور بہت سے آقاؤں کی غلامی کا فرق تو خوب سمجھ لیتے ہیں' مگر ایک خدا کی بندگی اور بہت سے خداؤں کی بندگی کا فرق جب سمجھانے کی کوشش کی جاتی ہے تو نادان بن جاتے ہیں۔ ❁❁❁

درس ۷

حزب اللہ بمقابلہ حزب الشیطان

انجینئر نوید احمد

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اِنَّمَا وَلِیُّکُمُ اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوا الَّذِیْنَ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ وَیُؤْتُوْنَ الزَّکٰوۃَ وَھُمْ رٰکِعُوْنَ ﴿۵۵﴾ وَمَنْ یَّتَوَلَّ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰہِ ھُمُ الْغٰلِبُوْنَ ﴿۵۶﴾ (المائدۃ)

لَا تَجِدُ قَوْمًا یُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ یُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ وَلَوْ کَانُوْٓا اٰبَآءَھُمْ اَوْ اَبْنَآءَھُمْ اَوْ اِخْوَانَھُمْ اَوْ عَشِیْرَتَھُمْ ط اُولٰٓئِکَ کَتَبَ فِیْ قُلُوْبِھِمُ الْاِیْمَانَ وَاَیَّدَھُمْ بِرُوْحٍ مِّنْہُ ط وَیُدْخِلُھُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھَا الْاَنْھٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْھَا ط رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمْ وَرَضُوْا عَنْہُ ط اُولٰٓئِکَ حِزْبُ اللّٰہِ ط اَلَآ اِنَّ حِزْبَ اللّٰہِ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۲۲﴾ (المجادلۃ)

اِنَّ الَّذِیْنَ یُحَآدُّوْنَ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ کُبِتُوْا کَمَا کُبِتَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِھِمْ وَقَدْ اَنْزَلْنَآ اٰیٰتٍ بَیِّنٰتٍ ط وَلِلْکٰفِرِیْنَ عَذَابٌ مُّھِیْنٌ ﴿۵﴾ یَوْمَ یَبْعَثُھُمُ اللّٰہُ جَمِیْعًا فَیُنَبِّئُھُمْ بِمَا عَمِلُوْا ط اَحْصٰىہُ اللّٰہُ وَنَسُوْہُ ط وَاللّٰہُ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ شَھِیْدٌ ﴿۶﴾

اِنَّ الَّذِیْنَ یُحَآدُّوْنَ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗٓ اُولٰٓئِکَ فِی الْاَذَلِّیْنَ ﴿۲۰﴾ کَتَبَ اللّٰہُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِیْ ط اِنَّ اللّٰہَ قَوِیٌّ عَزِیْزٌ ﴿۲۱﴾

اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ تَوَلَّوْا قَوْمًا غَضِبَ اللّٰہُ عَلَیْھِمْ ط مَا ھُمْ مِّنْکُمْ وَلَا مِنْھُمْ لا وَیَحْلِفُوْنَ عَلَی الْکَذِبِ وَھُمْ یَعْلَمُوْنَ ﴿۱۴﴾ اَعَدَّ اللّٰہُ لَھُمْ عَذَابًا شَدِیْدًا ط اِنَّھُمْ سَآءَ مَا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ﴿۱۵﴾ اِتَّخَذُوْٓا اَیْمَانَھُمْ جُنَّۃً فَصَدُّوْا عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَلَھُمْ عَذَابٌ مُّھِیْنٌ ﴿۱۶﴾ لَنْ تُغْنِیَ عَنْھُمْ اَمْوَالُھُمْ وَلَآ اَوْلَادُھُمْ مِّنَ اللّٰہِ

شَیْئًا ط اُولٰٓئِکَ اَصْحٰبُ النَّارِ ط ھُمْ فِیْھَا خٰلِدُوْنَ ﴿۱۷﴾ یَوْمَ یَبْعَثُھُمُ اللّٰہُ جَمِیْعًا فَیَحْلِفُوْنَ لَہٗ کَمَا یَحْلِفُوْنَ لَکُمْ وَیَحْسَبُوْنَ اَنَّھُمْ عَلٰی شَیْءٍ ط اَلَآ اِنَّھُمْ ھُمُ الْکٰذِبُوْنَ ﴿۱۸﴾ اِسْتَحْوَذَ عَلَیْھِمُ الشَّیْطٰنُ فَاَنْسٰھُمْ ذِکْرَ اللّٰہِ ط اُولٰٓئِکَ حِزْبُ الشَّیْطٰنِ ط اَلَآ اِنَّ حِزْبَ الشَّیْطٰنِ ھُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۱۹﴾ (المجادلۃ)

تمہیدی نکات

۱) منتخب نصاب نمبر۲ کا درسِ ہفتم سورۃ المائدۃ آیات ۵۵ تا ۵۶‘ سورۃ المجادلہ آیت ۲۲‘ سورۃ المجادلہ آیات ۵ تا ۶‘ سورۃ المجادلہ آیات ۲۰ تا ۲۱ اور سورۃ المجادلہ آیات ۱۴ تا ۱۹ کے مطالعہ پر مشتمل ہے۔

۲) منتخب نصاب نمبر۲ کے چھ دروس میں ہم دینی فرائض کے جامع تصور اور بالخصوص اقامت دین کے لیے جدوجہد کی فرضیت‘ اقامت دین کی جدّوجُہد کا مقصد یعنی قیامِ عدل‘ سیرتِ نبوی ﷺ کی روشنی میں اقامتِ دین کا طریقہ کار‘ اِس مقصد کے لیے بنائی جانے والی جماعت کا نظم اور اِس نظم کے تقاضے اور اقامتِ دین کے لیے کام کرنے والوں کے مطلوب اوصاف سمجھ چکے ہیں☆۔ اب اِس ساتویں درس میں ہم نے یہ سمجھنا ہے کہ اقامتِ دین کی راہ میں رکاوٹیں ڈالنے والے عناصر کا کردار کیا ہوتا ہے اور دین کے خادموں کا اُن کے ساتھ کیا رویہ ہونا چاہیے؟

۳) ایسی اجتماعیت جو دنیا میں اللہ کے دین کی نصرت وحمایت کے لیے تشکیل پائے ایک قیمتی سرمایہ ہے۔ یہ اجتماعیت حزب اللہ یعنی اللہ کی پارٹی ہے اور اللہ تعالیٰ کو انتہائی محبوب ہے۔ البتہ یہ اجتماعیت شیطان کے لیے بہت تکلیف دہ ہے۔ شیطان اپنے کارندوں کے ذریعہ اِس اجتماعیت میں انتشار پیدا کرنے کی سرتوڑ کوشش کرتا ہے۔ اُس کے کارندے منافقین کی صورت میں جماعت کے اندر بھی ہوتے ہیں اور کھلم کھلا مخالفین کی صورت میں باہر سے بھی حملہ آور ہوتے ہیں۔ اندر کے دشمن آستین کے سانپ ہیں جو مخفی حزب الشیطان بن جاتے ہیں اور باہر کے مخالفین ظاہری حزب الشیطان کا کردار ادا کرتے ہیں۔ حزب اللہ کے اراکین کے لیے ضروری ہے کہ وہ حزب اللہ کے استحکام کے لیے شیطانی قوتوں کے کردار کو سمجھیں اور اُن کی سازشوں کو ناکام بنانے کی بھرپور کوشش

☆ واضح رہے کہ اس سلسلۂ دروس کا درس نمبر۶‘ ستمبر اور اکتوبر ۲۰۱۰ء کے شماروں میں شائع ہوا تھا۔

کریں۔ بلاشبہ حزب اللہ ایک امانت ہے جس کی حفاظت ہم پر لازم ہے اور اِس حفاظت کے لیے ہمیں معلوم ہونا چاہیے کہ کون کون سے امور ہیں جنہیں پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔

آیات پر غور و فکر

حزبُ اللہ کا طرزِ عمل

انسانوں میں سے وہ لوگ سعادت مند ہیں جو اللہ تعالیٰ کے دین پر عمل کرنے والے' اُس کی تعلیمات کو فروغ دینے والے اور اُس کے اجتماعی احکامات کے نفاذ کے لیے تَن' مَن اور دھن لگانے والے ہوں۔ اللہ تعالیٰ ایسے نفوسِ قدسیہ کو ''حزب اللہ'' یعنی اپنی پارٹی قرار دیتا ہے اور اُن کے طرزِ عمل کی تحسین کر کے اُنہیں کامیابیوں کی بشارت دیتا ہے۔ آیئے حزب اللہ کے طرزِ عمل کو آیاتِ قرآنیہ کی روشنی میں سمجھتے ہیں۔

سورۃ المائدۃ' آیت ۵۵

﴿اِنَّمَا وَلِیُّکُمُ اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ﴾ ''بے شک تمہارے دوست تو اللہ اور اُس کے رسولؐ ہیں'' ..... ﴿وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا﴾ ''اور وہ جو ایمان لائے'' .....﴿الَّذِیْنَ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ﴾ ''جو قائم کرتے ہیں نماز'' ..... ﴿وَیُؤْتُوْنَ الزَّکٰوۃَ﴾ ''اور دیتے ہیں زکوٰۃ'' ..... ﴿وَھُمْ رٰکِعُوْنَ﴿۵۵﴾﴾ ''اور وہ عاجزی اختیار کرنے والے ہیں۔''

◆ اِس آیت میں حزب اللہ میں شامل ساتھیوں کے لیے ایک سلسلۂ ولایت کا ذکر ہے۔ غور کیجیے کہ لفظ ''ولایت'' کا مفہوم کیا ہے؟ اردو میں ہم محبت' حمایت' پشت پناہی' مددگاری جیسے بہت سے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ اِن سب کا خلاصہ عربی زبان میں نسبتِ ولایت ہے۔ انسان ولی اُسے بناتا ہے جس پر اُسے اعتماد ہو کہ یہ میرا خیر خواہ اور ہر مشکل میں میرا ساتھ دینے والا ہے۔

◆ اِس آیت میں آگاہ کیا گیا ہے کہ حزب اللہ میں شامل ساتھیوں کے سلسلۂ ولایت کی تین کڑیاں ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے رشتۂ ولایت' اُس کے رسول ﷺ سے اور اہلِ ایمان سے۔

اللہ تعالیٰ سے رشتۂ ولایت

◆ ﴿اِنَّمَا وَلِیُّکُمُ اللّٰہُ﴾ سے مراد یہ ہے کہ دل اِس پر ٹھک جائے کہ ہمارا دوست' ساتھی' ہمدرد' خیر خواہ' پشت پناہ' حامی' مددگار اللہ سبحانہٗ تعالیٰ ہے۔ ایمان کا لُبِّ لُباب اور حاصل

یہ ہے کہ اللہ اور بندے کے مابین ایک رشتۂ ولایت قائم ہو جائے۔ سورۃ البقرۃ آیت ۱۶۵ میں اِس حقیقت کا بیان یوں ہوا کہ: ﴿وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ ط﴾ یعنی وہ لوگ کہ جو حقیقتاً مؤمن ہیں وہ اللہ کے ساتھ محبت میں شدید ترین ہوتے ہیں۔ سورۂ بنی اسرائیل آیت ۲ میں وارد شدہ حکم ﴿اَلَّا تَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِیْ وَکِیْلًا﴿۲﴾﴾ یعنی ''میرے سوا کسی اور پر توکل نہ کرو'' کے مطابق انسان کا کل بھروسہ اور اعتماد اللہ تعالیٰ ہی پر قائم ہو جائے۔

◆ اللہ تعالیٰ سے رشتہ ولایت اصل میں سلسلہ ولایت کی بنیاد ہے۔ اُس کی محبت اگر تمام محبتوں پر غالب نہیں تو یہ سلسلہ آگے چل ہی نہیں سکتا۔ مطلوب تو یہ ہے کہ معیارِ محبت و نفرت اور دوستی و عداوت اُسی کی ذات پر آ کر ٹھہر جائے۔ جیسا کہ حدیثِ مبارکہ میں مذکور ہے کہ:

((مَنْ اَحَبَّ لِلّٰہِ وَاَبْغَضَ لِلّٰہِ وَاَعْطٰی لِلّٰہِ وَمَنَعَ لِلّٰہِ فَقَدِ اسْتَکْمَلَ الْاِیْمَانَ))(۱)

''جس نے محبت کی اللہ کے لیے اور ناراض ہوا اللہ کی خاطر اور دیا اللہ کے لیے اور روکا اللہ کے لیے تو یقیناً اُس نے اپنا ایمان مکمل کر لیا۔''

◆ اگر اللہ تعالیٰ کی ذات کو معیارِ محبت و نفرت نہ بنایا تو پھر دوستیاں منتشر ہوں گی اور محبتیں مختلف سمتوں میں بکھر جائیں گی۔ کسی سے ایک اعتبار سے محبت ہو گی اور کسی سے دوسرے اعتبار سے۔ اِس محبت کو منظم اور یکسو کرنے کے لیے اور اِس قلبی تعلق کو ایک زنجیر کی شکل دینے کے لیے پہلا قدم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے رشتہ ولایت استوار کیا جائے اور اُسے ہی دیگر ولایتوں کا معیار بنایا جائے۔

◆ ہمارے لیے یہ حقیقت بہت بڑی بشارت ہے کہ اللہ تعالیٰ سے رشتۂ ولایت باہمی ہوتا ہے۔ اہلِ ایمان اللہ تعالیٰ کے اولیاء ہوتے ہیں اور وہ اہلِ ایمان کا ولی ہوتا ہے۔ ارشاداتِ باری تعالیٰ ہیں:

﴿اَلَآ اِنَّ اَوْلِیَآءَ اللّٰہِ لَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ﴿۶۲﴾ اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَکَانُوْا یَتَّقُوْنَ﴿۶۳﴾﴾ (یونس)

''سنو! بے شک جو اللہ کے دوست ہیں' نہ ان پر کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے اور اللہ کی نافرمانی سے بچتے رہے۔''

﴿اَللّٰہُ وَلِیُّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یُخْرِجُھُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ ط﴾ (البقرۃ:۲۵۷)

''اللہ دوست ہے اُن کا جو ایمان لائے۔ وہ نکالتا ہے اُنہیں اندھیروں سے روشنی کی طرف۔''

(۱) سنن ابی داوٗد' کتاب السنۃ' باب الدلیل علی زیادۃ الایمان و نقصانہ۔

اللہ کے رسول ﷺ سے رشتۂ ولایت

◆ جس طرح اللہ کی اطاعت اور رسول ﷺ کی اطاعت ایک وحدت ہے ﴿مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ۚ﴾ (النساء:۸۰) ''جس نے رسول (ﷺ) کی اطاعت کی تو یقیناً اُسی نے اللہ کی اطاعت کی''..... اِسی طرح کا معاملہ اللہ کی محبت اور رسول ﷺ کی محبت کا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی محبت اصل میں اللہ تعالیٰ کی محبت کا لازمی اور منطقی نتیجہ ہے۔ آپ ﷺ ہی نے ہمیں اللہ تعالیٰ سے متعارف کرایا' اُس سے ہمارا تعلق جوڑا' انتہائی مشقتیں جھیل کر ہم تک دین کی تعلیمات پہنچائیں اور دین پر عمل کے لیے اُسوۂ کامل پیش فرمایا۔ بلاشبہ آپ ﷺ ہی محسنِ انسانیت ہیں اور اللہ کی محبت کے ساتھ آپ ﷺ کی محبت بھی ناگزیر ہے۔ اور جب تک باقی تمام چیزوں اور شخصیتوں کی محبت پر آپ ﷺ کی محبت غالب نہیں ہوگی' ایمان کا تقاضا پورا نہیں ہوگا۔ حدیث نبوی ﷺ ہے:

((لَا يُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ حَتّٰى اَكُوْنَ اَحَبَّ اِلَيْهِ مِنْ وَّالِدِهٖ وَوَلَدِهٖ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ))(۱)

''تم میں سے کوئی مؤمن نہیں ہوسکتا یہاں تک میں اس کے لیے زیادہ محبوب ہو جاؤں اُس کے والد اور اُس کے بیٹے اور تمام لوگوں سے۔''

اہلِ ایمان سے رشتۂ ولایت

◆ جب رشتہ ولایت ومحبت اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کے ساتھ قائم ہو جائے تو پھر محبت کے کہیں بھٹکنے کا کوئی امکان ہی نہیں ہے۔ اب یہ محبت ہوگی اُن کے لیے جو اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسول ﷺ کی تعلیمات پر دل و جان اور ظاہر و باطن سے ایمان لا چکے ہیں' چاہے اُن سے کوئی خونی' نسلی' لسانی اور وطنی تعلق نہ ہو۔ اُن کے نزدیک اصل رشتہ خونی نہیں بلکہ نظریہ اور مشن کی ہم آہنگی کا رشتہ ہوتا ہے۔ اگر یہ رشتہ موجود ہے تو محبت ہے اور اگر موجود نہیں ہے تو چاہے حقیقی بھائی ہو' چاہے باپ اور بیٹے کی نسبت ہو' چاہے بیوی اور شوہر کا تعلق ہو' سب پس منظر میں جا کر دھندلا جائے گا۔ بلاشبہ قانونی معاملات کی نوعیت کچھ اور ہے۔ اگر خونی رشتے دار دین کے حوالے سے ساتھ دینے والے نہیں ہوں گے تو مجبوراً انسان جب تک شریعت اجازت دیتی ہے اُن سے کوئی تعلق تو رکھے گا لیکن اگر واقعتاً اُس کی سمت درست ہو چکی

(۱) صحيح البخارى' كتاب الايمان' باب حبّ الرسول من الايمان۔ وصحيح مسلم' كتاب الايمان' باب وجوب محبة رسول الله ﷺ اكثر من الاهل والولد والوالد.....

ہے تو پھر اُن کے ساتھ بیٹھنے میں اُسے کبھی بھی لطف نہیں آئے گا۔ اُس کا دل لگاؤ' تعلق خاطر اور محبت قلبی کا رشتہ صرف اُن سے ہوگا جو نظریہ' مشن' سوچ اور فکر کے اعتبار سے ہم آہنگی رکھتے ہیں۔ اُن کے پاس بیٹھنے میں اُسے لطف آئے گا اور ایک اپنائیت سی محسوس ہوگی۔

◆ اللہ تعالیٰ نے یہاں بہت کڑا معیار مقرر فرما دیا ہے۔ ہم سب اللہ اور اُس کے رسول ﷺ پر ایمان لانے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ ہمارا یہ دعویٰ سچا ہے اگر ہمیں اپنے رشتہ داروں سے زیادہ محبت ہم مقصد ساتھیوں کے ساتھ ہے۔ اگر معاملہ اِس کے برعکس ہے تو پھر ہمارے ایمان کا دعویٰ کھوکھلا ہے اور اِس کی کوئی حقیقت نہیں۔

کن اہلِ ایمان سے رشتۂ ولایت؟

◆ قانونی اعتبار سے اہلِ ایمان میں ہر طرح کے مسلمان شامل ہیں' خواہ وہ باعمل ہوں یا بے عمل۔ آیت زیر درس میں وضاحت کر دی گئی کہ رشتۂ ولایت اُن اہلِ ایمان سے قائم کیا جائے جو نماز قائم کرتے ہیں' زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور عاجزی اختیار کرتے ہیں۔ نماز کے قیام اور زکوٰۃ کی ادائیگی کی وضاحت تو منتخب نصاب کے دروس میں ہوتی رہی ہے۔ یہاں اہلِ ایمان کی تیسری شان بیان ہوئی ہے عاجزی' انکساری اور فروتنی۔ ﴿اَلَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا﴾ ''جو زمین پر دبے پاؤں چلتے ہیں'' کے مصداق اُن کی نشست و برخاست سے' اُن کی چال ڈھال سے یہ اندازہ ہو رہا ہو کہ وہ خود کو آقا نہیں بندہ سمجھتے ہیں۔ ایک طرف ﴿رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ﴾ ''باہم رحمت و شفقت کرنے والے'' یا ﴿اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ ''مؤمنوں پر بہت نرم'' کے مصداق اپنے ہم مقصد ساتھیوں کے لیے ہر طرح کا ایثار کرنے والے ہوتے ہیں۔ دوسری طرف اللہ تعالیٰ کے ہر حکم کے سامنے سرِ تسلیم خم کر کے سعادت مندی کی یہ روش قائم کرتے ہیں کہ:

﴿وَمَنْ اَحْسَنُ دِيْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ وَّاتَّبَعَ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ۭ وَاتَّخَذَ اللّٰهُ اِبْرٰهِيْمَ خَلِيْلًا ۝۱۲۵﴾ (النساء)

''اور کون اچھا ہے دین کے لحاظ سے اُس سے جس نے جھکا دیا اپنا چہرہ اللہ کے لیے اور وہ نیک بھی ہے اور اُس نے پیروی کی ابراہیمؑ کے راستے کی جو بالکل یکسو تھے اور بنا لیا اللہ نے ابراہیمؑ کو دوست۔''

◆ عام مسلمانوں کے جو بھی قانونی حقوق ہیں وہ ادا کرنے کی پوری کوشش کی جائے'

لیکن دلی تعلق اور اُلفت صرف اُن مسلمانوں سے ہو جو مذکورہ بالا صفات کے حامل ہیں۔

◆ ﴿هُمْ رٰكِعُوْنَ﴾ ''وہ عاجزی اختیار کرنے والے ہیں'' کے بارے میں ایک رائے یہ ہے کہ اِس کا تعلق ﴿يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ﴾ ''وہ زکوٰۃ دیتے ہیں'' کے ساتھ ہے۔ کوئی شخص کسی کو کچھ دے رہا ہوتا ہے تو اِس میں ایک فطری بات ہے کہ دینے والا اپنے آپ کو اُس لینے والے سے بالاتر سمجھ بیٹھتا ہے۔ بلکہ اِس فطری بات کا اظہار ایک حدیث میں بھی ہوا ہے کہ ((اَلْيَدُ الْعُلْيَا خَيْرٌ مِنَ الْيَدِ السُّفْلٰى))(۱) ''اوپر والا ہاتھ نیچے والے ہاتھ سے بہتر ہے''۔ یہ حدیثِ مبارکہ انفاق کی ترغیب دلانے کے لیے ہے۔ مزید یہ کہ اِس ارشادِ نبوی ﷺ میں ایک طرح کی تعلیم بھی ہے کہ لینے سے حتی الامکان بچنا چاہیے۔ انسان اپنی عزتِ نفس کی حفاظت کرے اور کوشش کرے کہ محنت سے کمائے اور اپنی ضروریات خود پوری کرے۔ البتہ جب دینے والا ہاتھ لینے والے ہاتھ سے بہتر ہے تو اب اِس کا ایک عکس دینے والے پر پڑ سکتا ہے۔ وہ یہ خیال کر سکتا ہے کہ میں برتر ہوں اور لینے والا کم تر ہے۔ اس خیال سے بچنے کی شعوری کوشش کرنی چاہیے۔ پسندیدہ روش یہ ہے کہ زکوٰۃ کی ادائیگی کا معاملہ اِس انداز سے ہو کہ آدمی عاجزی سے اور جھک کر دے رہا ہو نہ کہ اکڑ کر اور احساسِ برتری کے ساتھ۔

◆ یہ معاملہ اِس اعتبار سے بھی اہم ہے کہ تحریک میں کچھ ایسے سعادت مند افراد بھی ہوتے ہیں جنہوں نے اپنی توانائیاں اللہ کے دین کے لیے وقف کر رکھی ہوتی ہیں۔ وہ اپنی ضروریات پوری کر سکتے ہیں' لیکن اللہ تعالیٰ کی راہ میں لگنے کی وجہ سے ایسا نہیں کر پاتے۔ وہ حاجت مند ہوتے ہیں لیکن مانگنے والے تو نہیں ہوتے۔ اب ظاہر بات ہے کہ اُن کی کوئی خدمت' اُن سے کوئی تعاون' اُن کی کوئی مدد اگر کی جائے گی تو جھک کر ہی کی جائے گی۔ سورۃ البقرۃ آیت ۲۷۳ میں ایسے لوگوں کو انفاق فی سبیل اللہ کا اوّلین حق دار قرار دیا گیا ہے:

﴿لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ ۫ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ ۚ تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمٰهُمْ ۚ لَا يَسْئَلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا ۭ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ۲۷۳﴾ (البقرۃ)

''(انفاق) اُن فقیروں کے لیے ہے جو روک گئے ہیں اللہ کی راہ میں (دینی مصروفیات کی وجہ سے) وہ استطاعت نہیں رکھتے کہ چل پھر سکیں زمین میں (معاش

(۱) صحیح البخاری' کتاب الزکوٰۃ' باب الاستعفاف عن المسألۃ۔ وصحیح مسلم' کتاب الزکاۃ' باب بیان ان الید العلیا خیر من الید السفلیٰ.....

کے لیے)' سمجھتا ہے اُنہیں ناواقف خوشحال اُن کے سوال نہ کرنے کی وجہ سے۔ تم پہچان سکتے ہو اُنہیں اُن کے چہروں سے' وہ نہیں مانگا کرتے لوگوں سے لپٹ کر' اور تم جو کچھ بھی خرچ کرتے ہو مال میں سے تو بے شک اللہ اُسے خوب جاننے والا ہے۔''

◆ فی سبیل اللہ سے مراد جہاد فی سبیل اللہ ہے' یعنی اللہ تعالیٰ کے دین کے غلبہ کے لیے جدوجہد کرنا۔ جو لوگ اِس جدوجہد میں لگے ہوئے ہیں وہ انفاق کے اوّلین مستحق ہیں۔ اِس کے ذیل میں وہ لوگ بھی آئیں گے جو صرف دین کا علم حاصل کرنے کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیں۔ اب اُن کے پاس وقت نہ ہو کہ اپنی معاشی ضروریات کے لیے دوڑ دھوپ کر سکیں۔ مثال کے طور پر اصحابِ صُفّہ میں شامل صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جو ہر وقت نبی اکرم ﷺ کی صحبت میں رہتے تھے' اُنہی کے ذریعہ سے نبی اکرم ﷺ کے مبارک ارشادات بڑے پیمانے پر پورے عالم میں پھیلے۔ اُنہی میں سے ایک حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ہیں کہ جو حدیث نبوی ﷺ کے پھیلانے کا سب سے بڑا ذریعہ بن گئے۔ اگرچہ وہ ۷ھ میں ایمان لانے والوں میں سے ہیں' لیکن اُن کی روایت کردہ احادیث کی تعداد (۵۳۷۴) صحابہ کرامؓ میں سب سے بڑھ کر ہے۔ اِس لیے کہ وہ تو اپنے آپ کو اللہ کے رسول ﷺ کے ساتھ گویا باندھ کر بیٹھ گئے تھے۔ ہر وقت آپؐ کے ساتھ سایہ کی طرح رہتے اور آپؐ کی مبارک زبان سے جاری ہونے والے ارشادات کو ذہن میں محفوظ کر لیتے۔ اِسی وجہ سے اُن کے ذریعے سے بہت بڑے پیمانہ پر علم حدیث عام ہوا۔

◆ مذکورہ بالا لوگ پیشہ ور بھکاری نہیں ہوتے' اُن کا فقر اختیاری ہوتا ہے۔ وہ اپنی عفت اور عزت کی حفاظت کرتے ہیں۔ وہ کسی کے سامنے دست سوال دراز کر کے اپنی عزتِ نفس ہتھیلی پر رکھ کر اُس کے سامنے پیش نہیں کرتے' بلکہ وہ خودداری کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ چونکہ وہ مانگتے نہیں ہیں' لہٰذا ناواقف شخص یہ سمجھے گا کہ یہ مالدار ہیں اور اِن کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اُن کی کیفیت کا اندازہ اُن کے چہروں سے کیا جا سکتا ہے۔ فاقہ کے اثرات اور معاشی پریشانی کی علامات اُن کے چہروں پر ظاہر ہوتی ہیں۔ ایسے افراد کو تلاش کر کے اُن کی مدد کرنا انفاق کا اوّلین ہدف ہونا چاہیے۔

◆ ایسے لوگوں کو جو کچھ دیا جائے گا وہ کسی احساسِ برتری کے تحت نہیں دیا جائے گا' بلکہ اِس احساس کے تحت دیا جائے گا کہ برتر وہ ہیں' ہم تو دنیا کے دھندوں میں لگے ہوئے ہیں۔ ہم اِس کام میں ہمہ وقت ہمہ تن نہیں آ سکے۔ یہ وہ ہیں کہ جنہوں نے ہمت کی ہے اور یہ چھلانگ لگائی ہے۔ اگر وہ قبول کر لیں تو اُن کا احسان ہے' نہ کہ ہمارا احسان۔ دوسرے یہ کہ یہ انفاق

خالصتاً رازداری کے ساتھ کرنا ہوگا۔ جو کچھ بھی اللہ تعالیٰ کی راہ میں دیا جائے گا وہ اُس ہستی کے علم میں ہے جس کی خوشنودی کے لیے دیا جا رہا ہے۔ اِس کے لیے کہیں اور اعلان کرنے اور اس کا کہیں چرچا کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر ایسے لوگوں کو سب کے سامنے دینے کی کوشش کی گئی تو وہ لینے سے انکار کر دیں گے۔ کہیں چھپ چھپا کر‘ منت کر کے‘ اُن کا شکریہ ادا کرتے ہوئے‘ اُن کے سامنے جھک کر پیش کیا جائے گا تو شاید وہ تعاون قبول کر لیں۔ یہ ہے مفہوم وَھُمْ رَاکِعُوْن کا‘ یعنی وہ عاجزی اختیار والے ہیں۔

سورۃ المائدۃ‘ آیت ۵۶

﴿وَمَنْ یَّتَوَلَّ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ﴾ ’’اور جو دوستی کرے گا اللہ اور اُس کے رسولؐ سے‘‘..... ﴿وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا﴾ ’’اور اُن لوگوں سے جو ایمان لائے‘‘ ..... ﴿فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰہِ ھُمُ الْغٰلِبُوْنَ ﴿۵۶﴾﴾ ’’تو بے شک اللہ کی جماعت ہی غالب آنے والی ہے۔‘‘

اِس آیت میں بشارت ہے کہ جو لوگ رشتۂ ولایت اللہ‘ اُس کے رسول ﷺ اور اہلِ ایمان سے قائم رکھتے ہیں تو وہی درحقیقت ’’حزب اللہ‘‘ یعنی اللہ کی پارٹی ہیں۔ مزید خوشخبری یہ ہے کہ اللہ کی پارٹی ہی غالب آنے والی ہے۔ معرکہ خیر و شر میں مختلف وقتی صورتیں اور نشیب و فراز تو آ سکتے ہیں لیکن آخری فتح اللہ کی پارٹی ہی کو حاصل ہوگی۔

سورۃ المجادلۃ‘ آیت ۲۲

﴿لَا تَجِدُ قَوْمًا یُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ﴾ ’’تم نہیں پاؤ گے اُن لوگوں کو جو ایمان رکھتے ہیں اللہ اور آخرت کے دن پر‘‘..... ﴿یُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ﴾ ’’کہ وہ محبت کریں اُن لوگوں سے جنہوں نے مخالفت کی اللہ اور اُس کے رسولؐ کی‘‘..... ﴿وَلَوْ کَانُوْٓا اٰبَآءَ ھُمْ﴾ ’’خواہ وہ ہوں اُن کے باپ‘‘..... ﴿اَوْ اَبْنَآءَ ھُمْ﴾ ’’یا اُن کے بیٹے‘‘..... ﴿اَوْ اِخْوَانَھُمْ﴾ ’’یا اُن کے بھائی‘‘..... ﴿اَوْ عَشِیْرَتَھُمْ﴾ ’’یا اُن کے رشتہ دار‘‘..... ﴿اُولٰٓئِکَ کَتَبَ فِیْ قُلُوْبِھِمُ الْاِیْمَانَ﴾ ’’یہ لوگ ہیں کہ اللہ نے نقش کر دیا ہے اُن کے دلوں میں ایمان‘‘..... ﴿وَاَیَّدَھُمْ بِرُوْحٍ مِّنْہُ﴾ ’’اور تقویت بخشی ہے اُنہیں ایک روح کے ساتھ اپنی طرف سے‘‘..... ﴿وَیُدْخِلُھُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھَا الْاَنْھٰرُ﴾ ’’اور وہ داخل کرے گا اُنہیں ایسے باغات میں بہتی ہیں جن کے نیچے سے نہریں‘‘..... ﴿خٰلِدِیْنَ فِیْھَا﴾ ’’ہمیشہ

رہنے والے ہیں اُن میں‘‘..... ﴿رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمْ﴾ ’’راضی ہو گیا اللہ اُن سے‘‘..... ﴿وَرَضُوْا عَنْہُ﴾ ’’اور وہ راضی ہو گئے اُس سے‘‘..... ﴿اُولٰٓئِکَ حِزْبُ اللّٰہِ﴾ ’’یہ لوگ اللہ کی جماعت ہیں‘‘..... ﴿اَلَآ اِنَّ حِزْبَ اللّٰہِ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۲۲﴾﴾ ’’سن لو! اللہ کی جماعت ہی وہ لوگ ہیں جو کامیاب ہونے والے ہیں۔‘‘

◆ اِس آیت میں حزب اللہ میں شامل افراد کا پہلا وصف یہ بیان کیا گیا کہ وہ اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں۔ یہ وصف دراصل اُن کے اخلاص کا مظہر ہے۔ سورۃ النساء آیت ۳۸ میں ارشاد ہوا:

﴿وَالَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَھُمْ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَلَا بِالْیَوْمِ الْاٰخِرِ﴾

’’اور وہ جو خرچ کرتے ہیں اپنے مال لوگوں کو دکھانے کے لیے اور وہ ایمان نہیں رکھتے اللہ پر اور نہ ہی آخرت کے دن پر۔‘‘

گویا مخلص وہی ہے جس کی نیکی کا مقصد اللہ تعالیٰ کو راضی کرنا اور صرف آخرت ہی میں اجر و ثواب حاصل کرنا ہو۔

◆ سورۃ المائدہ آیت ۵۵ میں بیان کیا گیا کہ حزب اللہ میں شامل افراد کی قلبی محبت اللہ‘ اُس کے رسول ﷺ اور باعمل اہلِ ایمان سے ہوتی ہے۔ اب سورۃ المجادلۃ کی اِس آیت ۲۲ میں آگاہ کیا جا رہا ہے کہ حزب اللہ میں شامل افراد کن لوگوں سے محبت نہیں رکھتے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسول ﷺ سے دشمنی اور بغض رکھتے ہیں۔

◆ نوٹ کیجیے کہ یہاں یہ نہیں کہا گیا کہ حزب اللہ میں شامل افراد اُن لوگوں سے محبت نہیں کرتے جو اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کا کفر کرتے ہیں‘ بلکہ ایسے لوگوں سے محبت کی نفی ہے جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی مخالفت کرنے والے ہیں۔ اہلِ کفر سے دلی محبت نہ کرنا تو ایمان کا بنیادی تقاضا ہے۔ یہاں تو اِس اعلیٰ وصف کا ذکر ہے کہ اللہ کے محبوب بندے اُن نام نہاد مسلمانوں سے بھی محبت نہیں کرتے جو اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کی مخالفت کرتے ہیں۔ جو نہیں چاہتے کہ دنیا میں اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کے احکامات کی بالادستی قائم ہو۔ خواہ ایسے لوگ والدین‘ بیٹے‘ بھائی یا کوئی اور رشتہ دار ہی کیوں نہ ہوں۔ جو اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسول ﷺ کے دشمن ہیں‘ اگر ہم اُن کے لیے اپنے دل میں کوئی نرم گوشہ رکھتے ہیں‘ تو پھر اِس آیت کی رُو سے ہم حزب اللہ کے نہیں حزب الشیطان کے سپاہی ہیں۔

◆ یہاں بالکل وہی مضمون ہے جو سورۃ التوبہ آیت ۲۴ میں ایک اور اسلوب میں آیا ہے:

﴿قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ ِۨاقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ﴿۲۴﴾﴾

''(اے نبی ﷺ!) فرمایئے: اگر ہیں تمہارے باپ اور تمہارے بیٹے اور تمہارے بھائی اور تمہاری بیویاں اور تمہارے دیگر رشتہ دار اور وہ مال جو تم نے خود کمائے ہیں اور وہ کاروبار کہ تم ڈرتے ہو جس میں خسارے سے اور وہ گھر جنہیں تم پسند کرتے ہو زیادہ محبوب تمہیں اللہ سے اور اُس کے رسولؐ سے اور اُس کی راہ میں جہاد کرنے سے تو تم انتظار کرو یہاں تک کہ لے آئے اللہ اپنا حکم' اور اللہ ہدایت نہیں دیتا فاسق قوم کو۔''

◆ آیت کے اگلے حصہ میں بشارت دی گئی کہ جو لوگ اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کے دشمنوں سے محبت نہیں رکھتے تو یہ اِس بات کا مظہر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کے دلوں پر ایمان کو نقش کر دیا ہے۔ گویا ایمان کی حقیقت اُن کے دلوں کی گہرائی میں اتر گئی ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے لیے یہ بشارت سورۃ الحجرات آیت ۷ میں اس طرح بیان کی گئی :

﴿وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ وَزَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ﴾

''لیکن اللہ نے محبوب کر دیا ہے تمہارے لیے ایمان کو اور خوشنما کر دیا ہے اُسے تمہارے دلوں میں۔''

◆ حزب اللہ کے افراد کے لیے دوسری بشارت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی روح کے ذریعہ اُن کی مدد فرماتا ہے۔ روح کا لفظ قرآنِ حکیم میں مختلف معانی میں استعمال ہوا ہے۔ ایک روح وہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کے خاکی وجود میں پھونکی ہے۔ پھر روح سے مراد حضرت جبرائیل علیہ السلام بھی ہیں۔ اِسی طرح یہ لفظ وحی کے لیے بھی آیا ہے۔ پھر اِس سے مراد وہ روحانی فیض بھی ہے جس سے انسان کو تسلی' سکون' حوصلہ' انشراح اور استقامت و ثبات حاصل ہوتا ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ اُنہیں وہ فیضانِ روحانی عطا فرماتا ہے کہ لوگ اُنہیں دیکھتے ہیں کہ وہ بظاہر مشکلات و مصائب میں ہیں' لوگوں کے نرغے میں آ گئے ہیں' لوگوں کی دشمنی اور عداوتوں کا مرکز بن گئے ہیں' لیکن خود اُن کو ایک باطنی راحت میسّر ہوتی ہے۔ یہ فیضانِ روحانی اللہ تعالیٰ فرشتوں کے ذریعہ بھی عطا کرتا ہے' قرآنِ حکیم کی آیات پر تدبّر سے بھی یہ دولت ملتی ہے اور ہر وقت اللہ تعالیٰ کی یاد اور اُس پر

بھروسہ بھی روحِ انسانی کو تقویت دے کر انسان کے لیے باطنی آسودگی کا باعث بنتا ہے ۔

ہر حال میں رہا جو ترا آسرا مجھے
مایوس کر سکا نہ ہجومِ بلا مجھے

◆ حزب اللہ کے افراد کے لیے تیسری بشارت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اُنہیں ہمیشہ ہمیش کی جنت میں داخل فرمائے گا۔ وہ جنت جس کے باغات بلند و بالا مقام پر ہیں اور جس کی نہریں اُن باغات کے دامن میں بہتی ہیں۔

◆ حزب اللہ کے افراد کے لیے چوتھی بشارت یہ ہے کہ ﴿رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ﴾ ''اللہ اُن سے راضی ہو گیا'' ﴿وَرَضُوْا عَنْهُ﴾ ''اور وہ اُس سے راضی ہو گئے''۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ کی رضا کا حصول بہت بڑی سعادت ہے' اِس لیے کہ خود اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ ؕ﴾ (التوبۃ: ۷۲) ''اور اللہ کی رضا سب سے بڑا انعام ہے''۔ بندوں کے اللہ تعالیٰ سے راضی ہونے سے مراد یہ ہے کہ دنیا میں وہ اِن سعید افراد کو جس حال میں رکھے وہ راضی برضائے ربّ رہتے ہیں۔ البتہ آخرت میں تو وہ اُنہیں ایسے بیش بہا انعامات عطا فرمائے گا کہ وہ خوش ہو جائیں گے۔

◆ آیت کے آخر میں آگاہ کر دیا گیا کہ یہ ہے اللہ کی جماعت جو بالآخر کامیاب ہونے والی ہے۔ اِس وقت یہ جماعت اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کے دشمنوں سے برسرِ پیکار ہے' بقول اقبال ؎

دنیا کو ہے پھر معرکۂ روح و بدن پیش
تہذیب نے پھر اپنے درندوں کو ابھارا

دراصل دنیا میں مادیت اور روحانیت کے درمیان معرکہ آرائی ہے۔ خالق کے مقابلے میں کائنات اور حیاتِ اُخروی کے مقابلے میں حیاتِ دُنیوی توجہ کا مرکز بن کر رہ گئی ہے۔ تہذیب و تمدن اور ثقافت کے نام پر بے حیائی' شیطنت اور درندگی دندنا رہی ہے۔ شریعت کے خلاف بغاوت و سرکشی کا راج ہے۔ دوسری طرف اللہ تعالیٰ کے بندے حزب اللہ کی صورت میں اِس فساد کے خلاف جدوجہد کر رہے ہیں۔ اُن کے پاس اسباب و وسائل کی قلت ہے' لیکن اگر اُنہوں نے استقامت کا مظاہرہ کیا اور مذکورہ بالا صفات کی اہلیت ثابت کر دی تو پھر آخر کار وہی کامیاب ہوں گے۔

اہم وضاحت

کافروں کے ساتھ حزب اللہ کے تعلق کے حوالے سے ایک اہم وضاحت سورۃ

الْمُمْتَحِنَہ آیات ۸ اور ۹ میں وارد ہوئی ہے۔ اِس وضاحت کے ذریعہ آگاہ کیا گیا کہ جس طرح سب مسلمان برابر نہیں اِسی طرح سب کافر بھی برابر نہیں۔ مسلمانوں میں منافق بھی ہیں اور مؤمن بھی۔ دوسری طرف کافروں میں کچھ تو ایسے ہیں جو اللہ' اُس کے رسول ﷺ اور اہلِ ایمان سے انتہائی بغض اور دشمنی رکھتے ہیں' غلبۂ دین کی جدوجہد کی پوری شدت کے ساتھ مخالفت کر رہے ہیں' جبکہ کچھ وہ ہیں جو اہل ایمان کے مدمقابل نہیں آتے اور غلبۂ دین کے راستے میں رکاوٹ نہیں بن رہے۔ اِن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے سورۃ الْمُمْتَحِنَہ کی آیت ۸ میں اجازت دی کہ اِن کے ساتھ کچھ نیکی' بھلائی اور عدل وانصاف کا معاملہ کیا جاسکتا ہے:

﴿لَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْٓا اِلَيْهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ۝﴾

''نہیں منع کرتا تمہیں اللہ اُن لوگوں سے جنہوں نے جنگ نہیں کی تم سے دین کے معاملہ میں اور نہیں نکالا تمہیں تمہارے گھروں سے کہ تم نیک سلوک کرو اُن کے ساتھ اور عدل کرو اُن کے ساتھ۔ بے شک اللہ پسند فرماتا ہے عدل کرنے والوں کو۔''

ایسے لوگوں سے ایک واجبی سا رواداری کا تعلق رکھا جائے گا لیکن مودّت یعنی دلی محبت کا رشتہ صرف اور صرف مخلص اہلِ ایمان سے ہی استوار کیا جائے گا۔ البتہ جو لوگ اسلام اور اہلِ ایمان کے دشمن ہیں اُن کے بارے میں اگلی آیت میں خبردار کر دیا گیا کہ:

﴿اِنَّمَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ قٰتَلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَاَخْرَجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ وَظٰهَرُوْا عَلٰٓى اِخْرَاجِكُمْ اَنْ تَوَلَّوْهُمْ ۚ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝﴾

''بے شک منع کرتا ہے تمہیں اللہ اُنہی لوگوں سے جنہوں نے جنگ کی تم سے دین کے معاملہ میں اور نکالا تمہیں تمہارے گھروں سے اور ایک دوسرے کی مدد کی تمہارے نکالنے میں کہ تم دوستی کرو اُن سے' اور جو دوستی کرے گا اُن سے تو وہی لوگ ظالم ہیں۔''

حزب الشیطان

اِس دنیا میں ازل سے دو جماعتوں کے درمیان کشمکش جاری ہے' بقول اقبال ؎

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفویؐ سے شرارِ بولہبی

یہ دو متصادم جماعتیں ہیں حزب اللہ اور حزب الشیطان۔ حزب اللہ کا کردار اور طرزِ عمل تو

ہمارے سامنے آچکا۔ اب ہم حزب الشیطان کے کردار اور طرزِ عمل کو سمجھنے کی کوشش کریں گے۔ حزب الشیطان کے دو عنصر ہیں۔ ایک عنصر بالکل ظاہر ہوتا ہے اور وہ سامنے سے وار کرتا ہے۔ دوسرا عنصر مخفی ہوتا ہے' کیونکہ یہ مسلمانوں کے اندر موجود ہوتا ہے۔ یہ وہ آستین کا سانپ ہے جو مسلمانوں کی جماعت کو اپنی سازشی حرکتوں سے اندر سے کھوکھلا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ عنصر ظاہری حزب الشیطان سے بھی زیادہ خطرناک اور نقصان دہ ہے۔ سورۃ المجادلہ (آیات ۵ تا ۶ اور ۲۰ تا ۲۱) میں حزب الشیطان کے ظاہری و مخفی دونوں عناصر کے کردار اور انجام کو بے نقاب کیا گیا ہے۔

ظاہری حزب الشیطان کا کردار اور انجام

آیات ۵ تا ۶

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يُحَاۗدُّوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ﴾ ''بے شک وہ لوگ جو مخالفت کرتے ہیں اللہ اور اُس کے رسولؐ کی''..... ﴿كُبِتُوْا﴾ ''وہ ذلیل کیے جائیں گے''..... ﴿كَمَا كُبِتَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ﴾ ''جیسے ذلیل کیے گئے تھے وہ لوگ جو اِن سے پہلے تھے''..... ﴿وَقَدْ اَنْزَلْنَآ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ ۭ﴾ ''اور یقیناً ہم نے نازل کر دی ہیں واضح آیات''..... ﴿وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ۝﴾ ''اور کافروں کے لیے ذلیل کرنے والا عذاب ہے''..... ﴿يَوْمَ يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا﴾ ''جس دن اُٹھائے گا اُنہیں اللہ سب کے سب کو''..... ﴿فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا ۭ﴾ ''پھر بتائے گا اُنہیں جو اُنہوں نے کیا''..... ﴿اَحْصٰىهُ اللّٰهُ وَنَسُوْهُ ۭ﴾ ''محفوظ رکھا تھا اُسے اللہ نے اور وہ بھول گئے تھے اُسے''..... ﴿وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ۝﴾ ''اور اللہ ہر چیز پر گواہ ہے۔''

◆ ظاہری حزب الشیطان ایسے کافروں کا گروہ ہے جو اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسول ﷺ کی کھلم کھلا مخالفت کرتے ہیں۔ وہ اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسول ﷺ کی شان میں گستاخیاں کرتے ہیں' اُن کے احکامات کا مذاق اڑاتے ہیں' اُن پر عمل درآمد اور نفاذ میں رکاوٹ ڈالتے ہیں اور اپنے خودساختہ قوانین نافذ کر دیتے ہیں۔

◆ اللہ تعالیٰ اپنی واضح آیات میں آگاہ کر چکا ہے کہ سابقہ قومیں اللہ اور اُس کے رسولوںؑ کی مخالفت اور اُن کے احکامات سے بغاوت کے کیسے بھیانک انجام سے دوچار ہو چکی

ہیں۔جن مجرموں نے شریعت کے خلاف قوانین بنائے اور اُن پر عمل کیا' وہ اللہ تعالیٰ کے فضل اور نظرِ عنایت سے محروم ہوگئے۔خود ساختہ قوانین کی وجہ سے اُن کے معاشرہ میں گمراہیاں' برائیاں اور ظلم و استحصال انتہا کو پہنچ گے اور وہ مجرم ذلت و رسوائی کی عبرتناک مثال بن گئے۔ اب اگر ہم مسلمان بھی ایسی مجرمانہ روش اختیار کریں گے تو ہمیں بھی ذلت کے گڑھے میں گرنے سے کوئی نہ بچا سکے گا۔

◆ خبردار کیا گیا کہ اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسول ﷺ کے ساتھ دشمنی کرنے والے دنیا میں تو رسوائی اور ناکامی سے دوچار ہو ہی رہے ہیں' اگر اپنی مجرمانہ روش سے باز نہ آئے تو روزِ قیامت بھی اُن کے لیے ذلت آمیز عذاب ہوگا۔وہ جرائم کر کے بھول جاتے ہیں' لیکن اللہ تعالیٰ نے اُن کا ایک ایک جرم محفوظ کر رکھا ہے۔اُس نے لکھ رکھا ہے کہ کس شخص نے' کب' کہاں' کیا حرکت کی؟ اِس حرکت کے بعد اُس کا اپنا ردِعمل کیا تھا؟ اِس حرکت کے کیا نتائج' کہاں کہاں کس کس شکل میں برآمد ہوئے۔جلد ہی مجرموں کو اُن کے تمام جرائم کی نوعیت' شدت اور اثرات کے اعتبار سے بھرپور سزا مل کر رہے گی۔

آیات ۲۰ اور ۲۱

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ یُحَآدُّوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗٓ﴾ ''بے شک وہ لوگ جو مخالفت کرتے ہیں اللہ اور اُس کے رسولؐ کی''..... ﴿اُولٰٓئِكَ فِی الْاَذَلِّیْنَ ۝۲۰﴾ ''وہی سب سے زیادہ ذلیل ہونے والوں میں سے ہیں''.....﴿كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِیْ ؕ﴾ ''لکھ دیا ہے اللہ نے کہ ضرور غالب ہو کر رہوں گا میں اور میرے رسولؐ''.....﴿اِنَّ اللّٰهَ قَوِیٌّ عَزِیْزٌ ۝۲۱﴾.....''بے شک اللہ بڑی قوت والا' زبردست ہے۔''

◆ اِن آیات میں ایک بار پھر ظاہری حزب الشیطان کا کردار رکھنے والوں کو وعید سنائی گئی ہے کہ وہ ذلیل ہو کر رہیں گے۔مزید یہ کہ اللہ تعالیٰ نے طے فرما دیا ہے کہ آخر کار غلبہ اُس کا اور اُس کے رسولوںؑ کا ہی ہوگا' البتہ اِس فیصلے کے ظہور میں وقت لگے گا۔اللہ تعالیٰ کٹھن حالات کے ذریعہ مؤمنوں کو آزمائے گا اور اُن میں سے کھرے اور کھوٹے کو علیحدہ کر دے گا۔پھر رسولؐ اور مشکلات میں ثابت قدم رہنے والے مؤمنین سرخرو ہوں گے اور اُن کے مخالفین تباہی سے دوچار ہوں گے۔

◆ یہ رسولوںؑ کے باب میں اللہ تعالیٰ کی ایک مستقل سنت ہے کہ وہ کبھی مغلوب نہیں

ہوں گے۔تاریخ شاہد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انتہائی طاقتور' خوشحال اور خوب وسائل رکھنے والی ایسی سرکش قوموں کو نیست و نابود کر دیا جنہوں نے رسولوںؑ کو جھٹلایا۔ہر رسولؑ اور اُن کے ساتھ اہلِ ایمان کو محفوظ رکھا۔

مخفی حزب الشیطان کا کردار

آیات ۱۴ تا ۱۵

﴿اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِیْنَ تَوَلَّوْا قَوْمًا غَضِبَ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ ؕ﴾ ..... ''کیا تم نے نہیں دیکھا اُن کو جو دوستی کرتے ہیں ایسے لوگوں سے غضب نازل کیا اللہ نے جن پر''..... ﴿مَا هُمْ مِّنْكُمْ وَلَا مِنْهُمْ ۙ﴾ ..... ''نہیں ہیں وہ تم میں سے اور نہ ہی اُن میں سے''.....﴿وَیَحْلِفُوْنَ عَلَى الْكَذِبِ وَهُمْ یَعْلَمُوْنَ ۝۱۴﴾.....''اور وہ قسمیں کھاتے ہیں جھوٹ پر جبکہ وہ جانتے ہیں''..... ﴿اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ عَذَابًا شَدِیْدًا ؕ﴾ ..... ''تیار کیا ہے اللہ نے اُن کے لیے بہت سخت عذاب''.....﴿اِنَّهُمْ سَآءَ مَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ۝۱۵﴾.....''بے شک وہ لوگ' برا ہے جو کچھ وہ کرتے رہے ہیں۔''

◆ اِس آیت میں مخفی حزب الشیطان کی پہلی نشانی یہ بتائی گئی کہ وہ دین کے اُن دشمنوں سے دلی دوستیاں رکھتے ہیں جن پر اللہ تعالیٰ کا غضب نازل ہوا۔قرآنِ حکیم اور احادیثِ مبارکہ کی روشنی میں یہودی وہ قوم ہیں جن پر اللہ تعالیٰ کا غضب در غضب نازل ہوا۔دورِ نبوی ﷺ میں منافقین اِن سے دوستی رکھتے تھے' اِن سے دوستی کو اپنے لیے عزت کا باعث سمجھتے تھے اور اِن کے مالدار ہونے کو اپنے لیے برے وقت کا سہارا سمجھتے تھے۔

◆ کافروں کے ساتھ کسی سابقہ تعلق' رشتہ داری یا مفاد کی وجہ سے دوستی برقرار رکھنا درحقیقت حزب اللہ کے لیے ایک کمزوری کا پہلو ہے۔یہ فصیل کا وہ رخنہ ہے جس سے دشمن کسی بھی وقت داخل ہو سکتا ہے اور مسلمانوں میں انتشار پیدا کر کے اُنہیں اپنے خلاف پھرپور وار کرنے سے روک سکتا ہے۔کافروں کے ساتھ دوستی کے مضر نتائج اور اثرات سے بچانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے قرآنِ مجید میں مسلمانوں کو سختی سے منع فرمایا کہ وہ کافروں کو دوست نہ بنائیں:

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْكٰفِرِیْنَ اَوْلِیَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِیْنَ ؕ
اَتُرِیْدُوْنَ اَنْ تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ عَلَیْكُمْ سُلْطَانًا مُّبِیْنًا ۝۱۴۴﴾ (النساء)

''اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو! نہ بناؤ کافروں کو دوست مومنوں کو چھوڑ کر۔ کیا تم چاہتے ہو کہ دے دو اللہ کو اپنے خلاف ایک کھلی دلیل؟''

گویا جس نے مؤمنوں کے مقابلہ میں کافروں کو دوست بنایا اُس نے خود ہی اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے سزا کا مستحق بنا دیا۔ اِس حکم کا تعلق افراد سے بھی ہے اور حکومت سے بھی۔ جس طرح ایک شخص کو کسی غیر مسلم سے دوستی کرنے میں نقصان کا اندیشہ ہے' اِسی طرح کوئی مسلمان حکومت بھی جو غیر مسلموں سے دوستی کے روابط قائم کرے گی نقصان ہی اٹھائے گی۔ ماضی میں کئی مثالیں موجود ہیں کہ ذاتی مفادات کی خاطر مسلمان حاکموں یا حکومت کے خواہش مند غداروں نے کافر ریاستوں سے دوستی کی اور مسلمان ریاستوں کو اِس دوستی کا عبرت ناک خمیازہ بھگتنا پڑا۔

◆ سورۃ النساء آیات ۱۳۸ اور ۱۳۹ میں کافروں کے ساتھ دوستی کرنے والوں کو منافقین قرار دیا گیا اور اُنہیں دردناک عذاب کی دھمکی دی گئی:

﴿بَشِّرِ الْمُنٰفِقِيْنَ بِاَنَّ لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمَا ۙ۝۱۳۸ نِ الَّذِيْنَ يَتَّخِذُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۭ اَيَبْتَغُوْنَ عِنْدَهُمُ الْعِزَّةَ فَاِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ۝۱۳۹﴾

''(اے نبی ﷺ!) بشارت دیجئے منافقین کو کہ اُن کے لیے دردناک عذاب ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو بناتے ہیں کافروں کو دوست مؤمنوں کو چھوڑ کر۔ کیا وہ تلاش کرتے ہیں اُن کے پاس عزت؟ تو بے شک عزت تو اللہ ہی کے لیے ہے سب کی سب۔''

منافقین کافروں سے دوستی اِس لیے کرتے ہیں تاکہ اِن ظاہری شان و شوکت رکھنے والوں سے تعلقات قائم کر کے عزت حاصل کریں۔ نتیجہ اِس کے بالکل برعکس ہوتا ہے۔ منافقین مسلمانوں کی نظروں سے بھی گر جاتے ہیں اور کافروں کی نظروں میں بھی ذلیل ہی رہتے ہیں۔ کافر جانتے ہیں کہ جو اپنوں کا وفادار نہ ہو وہ ہمارا کیا وفادار ہوگا۔ جو شخص ہر حال میں ایک ہی گروہ سے منسلک رہے وہ دشمن کی نظروں میں بھی قابل اعتماد ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ عزت دینے والا صرف اور صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ منافقین اللہ تعالیٰ کو ناراض کر کے اُس کے دشمنوں سے دوستی کر رہے ہیں۔ کیا اللہ تعالیٰ کو ناراض کر کے عزت پا سکیں گے؟

◆ اِس آیت میں مزید ارشاد ہوا کہ منافقین بظاہر تمہاری صفوں میں شامل ہیں' دوستی اور محبت کا اظہار کر رہے ہیں کافروں سے' لیکن وہ نہ تمہارے ہیں نہ اور کافروں کے۔ وہ صرف اپنی ذات اور اپنے مفادات کے ساتھ مخلص ہیں۔ حقیقت میں نہ مسلمانوں کے خیر خواہ ہیں اور

نہ کافروں کے دوست۔ سورۃ النساء آیت ۱۴۳ میں فرمایا گیا:

﴿مُّذَبْذَبِيْنَ بَيْنَ ذٰلِكَ ۡ لَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ وَلَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ ۭ﴾

''گومگو کا شکار ہیں کفر اور ایمان کے درمیان۔ نہ اِن (مسلمانوں) کی طرف ہیں نہ اُن (کافروں) کی طرف۔''

◆ منافقین جان بوجھ کر جھوٹی قسمیں کھا کر مسلمانوں کو یقین دلاتے ہیں کہ وہ اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ مخلص ہیں۔ دوسری طرف اسلام کے دشمنوں سے کہتے ہیں ہم مسلمانوں سے تو دل لگی کر رہے ہیں: ﴿اِنَّا مَعَكُمْ ۙ اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ ۝۱۴﴾ (البقرۃ) ''بے شک ہم تمہارے ساتھ ہیں' ہم تو (مسلمانوں سے) صرف مذاق کرنے والے ہیں''۔ جب آدمی جھوٹی قسم کھا رہا ہوتا ہے تو وہ غیر شعوری نہیں ہوتی۔ اُسے معلوم ہوتا ہے کہ میں جھوٹ پر قسم کھا رہا ہوں۔ گویا ممکن ہے کہ کسی کا نفاق ابتدا میں غیر شعوری ہو لیکن جھوٹی قسم کھانے پر وہ شعوری نفاق بن جاتا ہے اور یہ مرضِ نفاق کی انتہا ہے۔ ایسے منافقین کے لیے دنیا میں رسوائی ہے اور آخرت میں شدید عذاب ہوگا۔ اللہ تعالیٰ ہمارے دلوں کو نفاق سے پاک فرمائے۔ آمین!

آیات ۱۶ تا ۱۷

﴿اِتَّخَذُوْٓا اَيْمَانَهُمْ جُنَّةً﴾ ''اُنہوں نے بنا لیا ہے اپنی قسموں کو ڈھال'' ..... ﴿فَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾ ''پس اُنہوں نے روکا اللہ کی راہ سے'' ..... ﴿فَلَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ۝۱۶﴾ ''سو اُن کے لیے رسوا کرنے والا عذاب ہے'' ..... ﴿لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْـــًٔا ۭ﴾ ''ان کے ہرگز کام نہ آئیں گے اُن کے مال اور اُن کی اولاد اللہ کے سامنے کچھ بھی'' ..... ﴿اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۭ﴾ ''یہ لوگ آگ والے ہیں'' ..... ﴿هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝۱۷﴾ ''وہ اُس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں۔''

◆ منافقین سے جب باز پرس کی جاتی ہے کہ مخالفین حق سے کیوں دوستی رکھتے ہو؟ تو قسم کھا کر کوئی عذر پیش کر دیتے ہیں۔ گویا قسم کو ڈھال بنا کر غلط کام کی سزا سے خود کو بچاتے ہیں۔ ایک طرف مسلمانوں کے سامنے قسمیں کھا کر اُن کی گرفت سے اپنی جان اور مال کو محفوظ کرتے ہیں اور دوسری طرف وہ نبی اکرم ﷺ' مسلمانوں اور اسلام کے خلاف ہر طرح کے شکوک و شبہات اور وسوسے لوگوں کے دلوں میں پیدا کرتے رہتے ہیں تاکہ لوگ یہ سمجھ کر اسلام قبول کرنے سے باز رہیں کہ جب گھر کے بھیدی ایسی خبریں دے رہے ہیں تو ضرور دال میں

کچھ کالا ہوگا۔

◆ اللہ تعالیٰ نے منافقین کے لیے رسوا کر دینے والا عذاب تیار کر رکھا ہے۔ جس مال اور اولاد کو محفوظ رکھنے کے لیے انہوں نے منافقانہ طرزِ عمل اختیار کر رکھا ہے وہ دونوں اُن کے کچھ کام نہ آئیں گے۔ وہ جہنم کی آگ میں ذلت و رسوائی کے ساتھ جلتے رہیں گے۔

آیات ۱۸ تا ۱۹

﴿یَوْمَ یَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ جَمِیْعًا﴾ ''جس دن اُٹھائے گا اُنہیں اللہ سب کے سب کو''..... ﴿فَیَحْلِفُوْنَ لَهٗ كَمَا یَحْلِفُوْنَ لَكُمْ﴾ ''تو وہ قسمیں کھائیں گے اُس کے سامنے جیسے وہ قسمیں کھاتے ہیں تمہارے سامنے''..... ﴿وَیَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ عَلٰی شَیْءٍ﴾ ''اور وہ گمان کریں گے کہ وہ ہیں کسی بنیاد پر''..... ﴿اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ﴾ ''سن لو! بے شک وہی جھوٹے ہیں''﴿اِسْتَحْوَذَ عَلَیْهِمُ الشَّیْطٰنُ﴾ ''غالب آ گیا ہے اُن پر شیطان''..... ﴿فَاَنْسٰىهُمْ ذِكْرَ اللّٰهِ﴾ ''سو اُس نے بھلا دی ہے اُنہیں اللہ کی یاد''..... ﴿اُولٰٓئِكَ حِزْبُ الشَّیْطٰنِ﴾ ''یہ ہے شیطان کی جماعت''..... ﴿اَلَآ اِنَّ حِزْبَ الشَّیْطٰنِ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ﴾ ''سن لو! بے شک شیطان کی جماعت ہی وہ لوگ ہیں جو خسارے میں جانے والے ہیں۔''

منافقین اِس معنی میں حزب الشیطان ہیں کہ شیطان پوری طرح سے اُنہیں گھیر کر اُن پر مسلط ہو چکا ہے۔ اُس نے اُنہیں اللہ تعالیٰ کی یاد اور اُس کی اطاعت سے غافل کر دیا ہے۔ وہ اپنی بے عملی کے لیے من گھڑت جواز پیش کرنے کے اِس قدر عادی ہو چکے ہیں کہ روزِ قیامت بھی جھوٹے بہانے پیش کرنے کی روش جاری رکھیں گے۔ وہ اللہ تعالیٰ کو دھوکہ دینے کی ناکام کوشش کریں گے اور آخر کار ہمیشہ ہمیش کے خسارے سے دوچار ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ شیطان کے حملوں اور حزب الشیطان کے شر سے ہماری حفاظت فرمائے۔ آمین!

اَللّٰهُمَّ طَهِّرْ قُلُوْبَنَا مِنَ النِّفَاقِ وَاَعْمَالَنَا مِنَ الرِّیَاءِ وَاَلْسِنَتِنَا مِنَ الْكَذِبِ وَاَعْیُنِنَا مِنَ الْخِیَانَةِ ، فَاِنَّكَ تَعْلَمُ خَائِنَةَ الْاَعْیُنِ وَمَا تُخْفِی الصُّدُوْرُ

''اے اللہ! پاک فرما دے ہمارے دلوں کو نفاق سے، ہمارے اعمال کو ریا سے، ہماری زبانوں کو جھوٹ سے اور ہماری آنکھ کو خیانت سے۔ بے شک تو جانتا ہے آنکھوں کی خیانت کو اور وہ سب کچھ جو سینے چھپائے رکھتے ہیں''..... آمین!

ثروت مندی اور ناداری کی حقیقت

پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

دنیا کی زندگی عارضی‘ ناپائیدار اور فانی ہے۔ اس طرح دنیا کی نعمتیں بھی حقیقی نہیں ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر انسان خواہ امیر ہے یا غریب‘ وہ امتحان میں ہے۔ گویا زندگی امتحان کا ایک وقفہ ہے۔ یہ دنیا دارالعمل ہے جہاں سے کوچ کر کے ہر ایک کو دارالجزاء میں جانا ہے‘ جہاں اس سے دنیا کی زندگی میں کیے ہوئے کاموں کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ اگر وہ ان سوالوں کے جواب دینے میں کامیاب ہوا تو اسے راحت و آرام کی ابدی اور حقیقی زندگی ملے گی‘ ورنہ وہ عذاب میں جھونکا جائے گا۔

دنیا کی زندگی میں اللہ تعالیٰ نے انسان کو بے شمار نعمتیں دے رکھی ہیں۔ مطلوب یہ ہے کہ انسان اللہ کی دی ہوئی ان نعمتوں کو اللہ کے حکم کے مطابق استعمال کرے۔ ان نعمتوں کا صحیح استعمال اُس کو اگلی اور حقیقی زندگی کی بے مثل نعمتوں سے سرفراز کرے گا‘ جبکہ ان کے غلط استعمال سے وہ اللہ تعالیٰ کے غضب کا شکار ہو کر آگ میں ڈالا جائے گا۔

دوسری بے شمار نعمتوں کی طرح مال و دولت بھی ایک اہم نعمت ہے۔ مال و دولت سے انسان جہاں دُنیوی زندگی کے لیے سہولتیں حاصل کر لیتا ہے وہاں اپنے عیش و آرام میں مشغول ہو کر دولت کو ناجائز اور حرام کاموں میں خرچ کرنے لگتا ہے اور یہ بات بھول جاتا ہے کہ اسے دولت کے استعمال کے بارے میں جواب دہی کرنا ہوگی۔ بلکہ یہ بھی بتانا ہوگا کہ یہ مال و دولت کیسے حاصل کیا‘ حرام ذرائع سے یا حلال ذرائع سے؟ چونکہ ابلیس بنی نوع انسان کا روزِ اوّل ہی سے دشمن ہے‘ لہٰذا وہ انسان کو دُنیوی زندگی کی رنگینیوں میں مبتلا کر کے آخرت کے فکر سے غافل کر دیتا ہے۔ کبھی کبھی تو وہ انسان کو اس دھوکے میں بھی مبتلا کر دیتا ہے کہ یہ نعمتیں اللہ تعالیٰ نے استعمال کرنے کے لیے ہی تو دی ہیں‘ ان سے بھرپور فائدہ اٹھانا چاہیے اور ان سے فائدہ نہ اٹھانا نعمتوں کے عطیے کی ناشکری ہے۔ لوگ اس فریب میں آ کر دوسری نعمتوں کی طرح مال و

دولت کو بھی فضول خرچی اور دیگر ناجائز کاموں میں صرف کرتے ہیں۔ اس طرح وہ مال و دولت کے بل بوتے پر جائز و ناجائز ہر طرح کا وہ کام کر گزرتے ہیں جس میں انہیں دُنیوی فائدہ نظر آتا ہے‘ حالانکہ اسلام ہمیں یہ سکھاتا ہے کہ انسان کی نظر ہمیشہ آخرت کی فلاح پر ہونی چاہیے اور دنیا کی زندگی اس طرح گزارنی چاہیے کہ ہر عمل سے آنے والی حقیقی زندگی میں کامیابی نظر آئے۔ صراطِ مستقیم پر چلتے ہوئے اگر اس زندگی میں تکالیف اور مشکلات پیش آئیں تو انہیں خندہ پیشانی سے برداشت کرے اور کبھی شیطان کے بہکاوے میں آ کر وہ کام نہ کرے جس سے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہوتی ہو۔ مؤمن اگر صبر کے ساتھ ہر تکلیف اور پریشانی برداشت کرے تو یہ اُخروی اجر و ثواب کا باعث ہے۔

آخرت کے مقابلے میں اس دنیا کی حقیقت کو واضح کرتے ہوئے نبی اکرم ﷺ نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے دونوں مونڈھے پکڑے اور فرمایا: ((كُنْ فِي الدُّنْيَا كَاَنَّكَ غَرِيْبٌ اَوْ عَابِرُ سَبِيْلٍ)) (صحیح البخاری) ”دنیا میں ایسے رہو جیسے کہ تم پردیسی ہو یا راستہ چلتے مسافر“۔ مونڈھے پکڑنے سے مقصد یہ تھا کہ حضرت عبداللہؓ بات کی اہمیت کو سمجھیں۔ رسول اللہ ﷺ کا طرزِ زندگی مسلمانوں کے لیے بہترین نمونہ ہے۔ آپؐ نے نہ تو کبھی دنیا کے مال و دولت کی خواہش کی اور نہ زندگی کی خوشحالی اور عیش و آرام طلب کیا‘ بلکہ مشقت اور سادگی کو پسند فرمایا۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ ایک دن کھجور کی چٹائی پر آرام فرما رہے تھے‘ جب سو کر اٹھے تو آپؐ کے جسم پر چٹائی کی بناوٹ کے نشان پڑے ہوئے تھے۔ یہ دیکھ کر ابن مسعودؓ نے عرض کیا: میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں‘ حضورؐ! اگر آپ اجازت دیں تو ہم آپ کے لیے بستر کا انتظام کر دیں۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ((مَا اَنَا وَالدُّنْيَا‘ اِنَّمَا اَنَا وَالدُّنْيَا كَرَاكِبٍ اسْتَظَلَّ تَحْتَ شَجَرَةٍ ثُمَّ رَاحَ وَتَرَكَهَا)) (سنن ابن ماجه) ”مجھے دنیا سے (یعنی دنیا کے ساز و سامان اور اس کی لذتوں اور راحتوں سے) کیا تعلق؟ میرا تو بس دنیا کے ساتھ ایسا ہی تعلق ہے جیسے کوئی مسافر کچھ دیر سایہ لینے کے لیے کسی درخت کے نیچے ٹھہرا اور پھر اپنی جگہ چھوڑ کر منزل کی طرف چل دیا۔“

دنیا کی زندگی اس اعتبار سے بڑی اہمیت کی حامل ہے کہ یہ آخرت کی حقیقی اور پائیدار زندگی سنوارنے کا وقفہ ہے۔ جو شخص اس کی اہمیت سے واقف ہوا اور لہو و لعب اور عیش پرستی میں نہ پڑا بلکہ بھلائی کے کام کرتا رہا وہ فلاح یاب ہوا۔ رسول اللہ ﷺ نے بار بار اس حقیقت کو

اجاگر فرمایا۔ آپؐ نے حضرت معاذ بن جبل ؓ کو یمن روانہ کیا تو ارشاد فرمایا: ''معاذ! آرام طلبی اور خوش عیشی سے بچتے رہنا۔ اللہ کے خاص بندے آرام طلب اور خوش عیش نہیں ہوا کرتے۔'' (مسند احمد) اگرچہ دنیوی نعمتوں سے جائز حد تک فائدہ اٹھانے کی اجازت ہے' مگر اللہ کے خاص بندوں کا مقام یہی ہے کہ وہ ناز و نعمت کی بجائے زندگی میں سادگی اپنائیں۔ اسلام حرص و ہوا' طمع اور لالچ سے روکتا ہے اور ایثار و قربانی کی تعلیم دیتا ہے۔ دنیا کا مال کمانے میں انتہائی مشغول ہونا اور کثرت کی خواہش کا غلام بن جانا' اس رویے کو اسلام پسند نہیں کرتا' کیونکہ ایسا رویہ رکھنے والا شخص کبھی مال و دولت سے سیر نہیں ہوتا۔ حضرت ابن عباس ؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے نبی اکرم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا:

((لَوْ كَانَ لِابْنِ آدَمَ وَادِيَانِ مِنْ مَالٍ لَا بْتَغَى ثَالِثًا وَلَا يَمْلَأُ جَوْفَ ابْنِ آدَمَ اِلَّا التُّرَابُ' وَيَتُوْبُ اللّٰهُ عَلٰى مَنْ تَابَ)) (متفق علیہ)

''اگر ابن آدم کے پاس مال سے بھری ہوئی دو وادیاں ہوں تو وہ تیسری بھی چاہے گا' اور ابن آدم کا پیٹ تو بس مٹی ہی سے بھرے گا' اور اللہ تعالیٰ اس بندے پر عنایت اور مہربانی کرتا ہے جو اپنا رخ اور اپنی توجہ اُس کی طرف کر لے۔''

گویا کثرت کی خواہش غافل بندے کو حق شناسی سے دور کر دیتی ہے۔ وہ اپنی زندگی کے ایام ختم کر رہا ہوتا ہے لیکن تیاری سے بے پروا رہتا ہے' یہاں تک کہ اس کی مہلت عمر کا آخری دن آ پہنچتا ہے۔ سورۃ التکاثر میں ارشاد ہے کہ ''تمہیں کثرت کی خواہش نے غافل رکھا' یہاں تک کہ تم قبروں میں جا پڑے۔ کاش تم جان لیتے (کہ دنیا کی زندگی غفلت میں گزارنے کا وقفہ نہیں)'' بلکہ یہاں نعمتوں کے بارے میں سوال ہوگا۔ اگر اللہ کی دی ہوئی نعمتوں کو بلا احتیاط نافرمانی کے کاموں میں صرف کیا تو جہنم واصل ہونا پڑے گا۔ یہاں خاص طور پر نعمت دولت کا ذکر ہے۔

چونکہ دولت کے ساتھ دنیوی سہولتیں اور آرام خریدا جا سکتا ہے تو جب انسان قوتِ خرید پاتا ہے تو غیر ضروری چیزیں بھی خرید لیتا ہے اور دولت کو بے جا خرچ کر کے اسراف اور تبذیر میں مبتلا ہو جاتا ہے' حالانکہ قرآن مجید میں فضول خرچی کرنے والوں اور اپنی دولت اللّوں تللّوں میں اڑانے والوں کو شیاطین کے بھائی کہا گیا ہے۔ دولت مندوں کی دولت میں ناداروں اور مفلسوں کا حصہ رکھ دیا گیا ہے جو انہیں دینا ضروری ہے۔ اگر اس میں کوتاہی کرتے

ہیں تو نافرمانوں میں شمار ہوں گے۔

اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق مال کی زکوٰۃ ادا کرنا فرض ہے۔ دولت جمع کرنے کے شوق میں زکوٰۃ ادا نہ کرنا اور اپنی دولت سے ضرورت مندوں کی مدد نہ کرنا بہت بڑا جرم ہے جو عاقبت کی زندگی کے لیے سخت عذاب کا باعث ہوگا۔ قرآن مجید میں اس بات کو بایں طور واضح کیا گیا ہے:

﴿وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝ يَّوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ وَظُهُوْرُهُمْ ۭ هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ ۝﴾ (التوبۃ)

''جو لوگ جمع رکھتے ہیں سونا اور چاندی اور اس کو خرچ نہیں کرتے اللہ کی راہ میں سو ان کو خوشخبری سنا دو دردناک عذاب کی۔ جس دن کہ آگ دہکائی جائے گی دوزخ کی اس مال پر' پھر داغے جائیں گے اس سے ان کے ماتھے' پہلو اور پیٹھیں۔ (کہا جائے گا:) یہ ہے جو تم نے جمع کر رکھا تھا اپنے واسطے' اب چکھو مزا اس کا جو تم جمع کرتے تھے۔''

دولت مند کے لیے گناہ کے کام آسان ہو جاتے ہیں۔ وہ شراب' زنا اور جوئے میں مبتلا ہو سکتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس بارے میں اُمت کو آگاہ فرما دیا۔ آپؐ نے فرمایا:

((اِنَّ لِكُلِّ اُمَّةٍ فِتْنَةٌ وَفِتْنَةُ اُمَّتِي الْمَالُ)) (سنن الترمذی)

''ہر اُمت کے لیے ایک خاص آزمائش ہوتی ہے' اور میری اُمت کی خاص آزمائش مال ہے۔''

دنیا کی زندگی میں روزی کمانا اس لیے ہے کہ اس سے جسم و جان کا رشتہ قائم رہے' اپنی ضروریات پوری کرنے کے لیے آدمی کے پاس پیسے موجود ہوں اور اسے کسی کے سامنے ہاتھ نہ پھیلانے پڑیں یا قرض نہ لینا پڑے۔ جس شخص کو اپنی اور بال بچوں کی خوراک' لباس' رہائش میسر ہو اور وہ صبر و شکر کے ساتھ زندگی گزار رہا ہو تو وہ خوش نصیب ہے کہ اس کے پاس فضول خرچی کا موقع ہی نہیں ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی بڑی مشہور حدیث ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''بندہ کہتا ہے میرا مال میرا مال' حالانکہ اس کے مال میں سے جو واقعی اس کا ہے وہ بس تین مدیں ہیں: ایک وہ جو اس نے کھا کے ختم کر لیا' دوسرے وہ جو اس نے پہن کر پرانا کر ڈالا اور تیسرے وہ جو اس نے راہِ خدا میں دیا اور اپنی آخرت کے واسطے ذخیرہ کر لیا' اور اس کے سوا جو

کچھ ہے وہ بندہ دوسروں کے لیے چھوڑ جانے والا ہے اور خود یہاں سے ایک دن رخصت ہونے والا ہے''۔(مسلم) اسی لیے یہ پسندیدہ نہیں کہ آدمی مال اکٹھا کرتا رہے اور پھر ڈھیروں مال اکٹھا کر کے چھوڑ جائے اور خود یہاں سے رخصت ہو جائے۔ جمع شدہ مال تو وارثوں کے ہاتھ لگے گا۔ اب یہ ان کا اختیار ہے کہ وہ اس مال کو اچھے کاموں میں لگا کر ثواب کمائیں یا ناجائز طور پر خرچ کر کے گناہ حاصل کریں اور مرنے والے کے لیے صرف حسرت رہ جائے کہ کاش میں اپنا مال اکٹھا کر کے نہ رکھتا بلکہ خود اپنے ہاتھ سے اچھے کاموں میں صرف کرتا۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنے اصحابؓ سے فرمایا: ''تم میں کون ایسا ہے جس کو اپنے مال سے زیادہ اپنے وارث کا مال پسند ہو؟'' لوگوں نے عرض کیا: ہم میں سے ہر ایک کا حال تو یہ ہے کہ اُس کو اپنے وارثوں کے مال سے زیادہ محبوب اپنا ہی مال ہے۔ آپؐ نے فرمایا: ''جب یہ بات ہے تو معلوم ہونا چاہیے کہ آدمی کا مال بس وہی ہے جس کو اس نے آگے چلتا کیا اور جس قدر اس نے بعد کے لیے رکھا وہ اس کا نہیں ہے بلکہ اس کے وارثوں کا ہے۔''

جن لوگوں نے اس زندگی میں ساری بھاگ دوڑ اور جدوجہد دنیا کمانے میں لگا دی اور آخرت کی فکر نہ کی تو گویا مال ہی ان کا مطلوب و مقصود ہو گیا۔ وہ مال اکٹھا کرنے میں ایسا گرفتار ہوئے کہ اللہ کے احکام اور حلال و حرام کی حدود کے بھی پابند نہ رہے اور عقل و دانش کے باوجود گھاٹے میں رہے۔ ایسے لوگوں پر نبی اکرم ﷺ نے لعنت کی ہے اور انہیں درہم و دینار کا بندہ قرار دیا ہے۔

رسول اللہ ﷺ دنیا جہان والوں کے لیے رحمت تھے۔ آپ ﷺ نے انسانوں کو ان تمام خطرات سے آگاہ کر دیا جو ان کے لیے خسران کے باعث ہیں اور وہ تمام کام بھی بتا دیے جو ابدی خسارے کا باعث ہوں گے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''میں تم پر فقر و ناداری آنے سے نہیں ڈرتا' لیکن مجھے تمہارے بارے میں یہ ڈر ضرور ہے کہ دنیا تم پر زیادہ وسیع کر دی جائے جیسا کہ تم سے پہلے لوگوں پر وسیع کی گئی تھی پھر تم اس کو بہت زیادہ چاہنے لگو جیسا کہ انہوں نے اس کو بہت زیادہ چاہا تھا اور پھر وہ تم کو برباد کر دے جیسے کہ اس نے ان اگلوں کو برباد کیا۔'' (متفق علیہ)

حضور اکرم ﷺ کو وہ صابر بندہ پسند ہے جو مفلس اور نادار ہو' لیکن صبر کے ساتھ فقر و فاقہ کی زندگی گزار رہا ہو۔ آپ ﷺ نے خود اپنے لیے فقر و فاقہ کی زندگی کو پسند کیا اور عیش و عشرت سے دور رہے۔ مال و دولت آ جانے کے باوجود بھی آپؐ کی زندگی میں سادگی رہی۔ جو لوگ

تنگدستی میں زندگی گزار رہے ہیں ان کے لیے رسول اللہ ﷺ کا اُسوۂ حسنہ سکون و اطمینان کا باعث ہے۔ وہ فقر و فاقہ کی تکلیفوں میں لذت اور راحت کا سامان پاتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ کو اپنا وہ مؤمن بندہ بہت پیارا ہے جو غریب و نادار اور عیال دار ہو اور اس کے باوجود باعفت ہو۔'' (ابن ماجہ) یعنی جو ناجائز طریقے سے مال حاصل کرنے اور کسی کے سامنے اپنی ضروریات ظاہر کرنے سے پرہیز کرتا ہو۔

ہر انسان کو طبعی حاجات ہیں۔ زندہ رہنے کے لیے اسے خوراک کی ضرورت ہے' پہننے کے لیے لباس اور رہنے کے لیے چھت کی ضرورت ہے۔ پھر اپنے بیوی بچوں کی ضروریات کا بھی وہ کفیل ہے۔ چنانچہ وہ محنت کرے اور دولت کمائے۔ قرآن مجید میں بایں الفاظ اس کا حکم ہے: ﴿وَلَا تَنْسَ نَصِيْبَكَ مِنَ الدُّنْيَا﴾ (القصص:۷۷) ''اور دنیا سے اپنا حصہ لینا نہ بھولیے''۔ اپنی ضروریات کے لیے اور ہمسایوں' مہمانوں اور غریبوں کی مدد کے لیے کمانا نہ صرف جائز بلکہ فضیلت کا باعث ہے۔ حدیث میں ہے: ((اَلْيَدُ الْعُلْيَا خَيْرٌ مِنَ الْيَدِ السُّفْلٰى)) (صحیح البخاری وصحیح مسلم) ''اوپر والا ہاتھ نیچے والے ہاتھ سے بہتر ہے۔'' جب آدمی کے پاس ضرورت سے زائد مال ہو تو وہ ضرورت مندوں کی خبر گیری کر سکتا ہے۔ روزی کمانے کے لیے کوشش اور جدوجہد جائز طریقوں سے کرنا انسان پر لازم ہے' مگر روزی کی کمی بیشی اللہ کے ہاتھ میں ہے: ﴿اَللّٰهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَيَقْدِرُ لَهٗ﴾ (العنکبوت:۶۲) ''اللہ پھیلاتا ہے روزی جس کے لیے چاہتا ہے اپنے بندوں میں سے اور ماپ کر دیتا ہے جس کو چاہے''۔ پس جس کی روزی کشادہ ہو وہ اسے نعمت سمجھے اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرے۔ خدا رسیدہ بزرگوں میں ایسے بھی ہوئے ہیں جو مالدار تھے مگر وہ اپنی دولت سے ضرورت مندوں کی مدد کے لیے ہر وقت تیار رہتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ ان کی فراخ روزی میں ناداروں کا حق ہے جو انہیں ناداروں کو دینا ہے' وہ ان پر احسان نہیں کرتے بلکہ ان کا حق ان کو دیتے ہیں۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے: ﴿وَفِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ۝۱۹﴾ (الذّٰریٰت) ''اور ان کے مالوں میں سائل اور محروم کے لیے حق ہے''۔ حق دار مالک ہوتا ہے۔ یوں اگر کوئی مالدار اپنے مال میں سے حق داروں کا حق ادا نہیں کرتا تو وہ خائن اور غاصب ہے۔ اسی لیے مال دار متقی اور پرہیزگار اپنی دولت کو سنبھال کر نہیں رکھتے بلکہ مستحقین کی تلاش میں رہتے ہیں کہ ان کا مال ان کے سپرد کریں۔ پس جائز طریقے سے مال کمانا اور اس میں سے فی

سبیل اللہ خرچ کرنا اچھا کام ہے۔

ایک روز رسول اللہ ﷺ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی مجلس میں تشریف لائے۔ آپؐ کے سر مبارک پر اُس وقت پانی کا اثر تھا۔ ایک صاحب نے عرض کیا: یارسول اللہ! ہم محسوس کرتے ہیں کہ اس وقت حضور کا مزاج بہت اچھا اور دل بہت خوش ہے۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''ہاں''۔ پھر اہلِ مجلس دنیوی خوشحالی اور دولت مندی کا کچھ تذکرہ کرنے لگے۔ تو آپ ﷺ نے اس سلسلہ میں ارشاد فرمایا: ''جو شخص اللہ تعالیٰ سے ڈرے اُس کے لیے مال داری میں کوئی مضائقہ اور کوئی حرج نہیں' اور صحت مندی صاحبِ تقویٰ کے لیے دولت مندی سے بھی بہتر ہے' اور خوش دلی بھی اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں سے ہے''۔ (مسند احمد) پس مالداری اور دولت مندی اگر تقویٰ کے ساتھ ہو تو اس میں کوئی خطرہ نہیں بلکہ فضیلت ہے۔ ایسا دولت مند شخص فی سبیل اللہ خرچ کر کے اپنی نیکیوں میں اضافہ کر لیتا ہے اور دولت کا اس طرح خرچ کرنا اسے جنت کے اعلیٰ درجوں تک پہنچنے کا ذریعہ بھی بن سکتا ہے۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ دولت مند صحابہؓ میں سے تھے اور انہوں نے ضرورت کے موقعوں پر بے حساب اور بے دریغ دولت لٹائی۔ دولت کے راہِ خدا میں خرچ کرنے پر رسول اللہ ﷺ نے ان کو دعائیں دیں اور بڑی بڑی بشارتیں سنائیں۔

اگر دولت مند آدمی خوفِ خدا رکھتا ہو اور فی سبیل اللہ خرچ کر کے کسی طرح کی نمائش نہ چاہتا ہو بلکہ اس کا مقصد محض رضائے الٰہی ہو تو وہ اللہ کا محبوب بندہ بن جاتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ اس متقی دولت مند سے محبت کرتا ہے جو نامعروف اور چھپا ہوا ہو'' (مسلم) یعنی وہ بندہ مال خرچ کر کے ناموری اور شہرت کا طالب نہ ہو بلکہ اس کا فی سبیل اللہ خرچ کرنا محض اللہ اور اس کے رسول کی فرمانبرداری کے لیے ہو۔

اگر انسان نیک مقاصد کے لیے دولت حاصل کرنے کی سعی کرے اور وہ اس میں کامیاب رہے تو نہ صرف وہ خوشحالی حاصل کر لیتا ہے بلکہ اسے اعلیٰ درجے کی فضیلت حاصل ہوگی۔ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں: ''جو شخص دنیا کی دولت بطریق حلال اس مقصد سے حاصل کرنا چاہے تاکہ اس کو دوسروں سے سوال نہ کرنا پڑے اور اپنے اہل وعیال کے لیے روزی اور آرام وآسائش کا سامان مہیا کر سکے اور اپنے پڑوسیوں کے ساتھ بھی وہ حسن سلوک کر سکے تو قیامت کے دن وہ اللہ کے حضور اس شان کے ساتھ حاضر ہوگا کہ اس کا چہرہ چودھویں رات

کے چاند کی طرح روشن اور چمکتا ہوگا۔'' (رواہ البیہقی فی شعب الایمان) معلوم ہوا کہ اچھی نیت اور نیک مقاصد کے لیے دنیا کا مال حلال ذریعے سے حاصل کرنے کی کوشش کرنا نہ صرف جائز بلکہ مستحسن ہے' اور ایسا شخص قیامت کے دن امتیازی شان کا حامل ہوگا اور اس کی خصوصی فضیلت ہوگی۔

رزق کا گھٹانا بڑھانا اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ کم رزق والا بھی امتحان میں ہے اور صاحبِ ثروت بھی۔ ان کی کامیابی کا دارومدار ان کے رویے پر ہے۔ اگر غریب اور نادار کم روزی کے ساتھ صبر کرتا ہے' شکوہ وشکایت نہیں کرتا اور کم مقدار کی روزی میں مشکل کے ساتھ وقت گزارتا ہے' راضی برضا کی کیفیت میں رہ کر فرائض ادا کرتا اور حقوق العباد میں بھی کوتاہی نہیں کرتا تو وہ خوش نصیب اور کامیاب ہے۔ اور اگر دولت مند آدمی جائز ذرائع سے مال حاصل کرتا ہے اور اس مال کو حقوق العباد کی ادائیگی میں خرچ کرتا ہے' زکوٰۃ کی ادائیگی میں کوئی کوتاہی نہیں کرتا تو وہ بھی خوش نصیب اور کامیاب ہے۔ اس کے برعکس نادار ہو یا دولت مند اگر رویّے میں متقی نہیں تو اسے ناکامی اور حسرت کا سامنا کرنا پڑے گا۔

بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

کے دو فکر انگیز خطابات پر مشتمل کتابچہ

توبہ کی عظمت اور تاثیر

اور موجودہ حالات میں کرنے کا اصل کام

اشاعتِ خاص: 65 روپے

اشاعتِ عام: 35 روپے

احوالِ موت

محمد سہیل (کراچی)

قرآن وحدیث میں موت کے وقت انسان کی کیفیت کا تذکرہ بڑی شدّ ومدّ سے آیا ہے‘ حالانکہ یہ کیفیت بظاہر تو عارضی معلوم ہوتی ہے۔ لہٰذا اس حوالے سے نوٹ کیجیے کہ یہ معاملہ عارضی نہیں ہوتا۔ موت کرتی کیا ہے؟ میں اس ضمن میں آپ کے سامنے کُل چار گزارشات رکھتا ہوں۔ سب سے پہلی بات ہے روح کے جسم سے جدا ہونے کا مرحلہ‘ جو بہت تکلیف دہ ہوتا ہے۔ اماں عائشہ صدیقہ ؓ فرماتی ہیں کہ جناب نبی کریم ﷺ کی بھی آخری ایام میں حالت ایسی ہوگئی تھی کہ آپؐ کے پاس کچھ پانی رکھا ہوا تھا۔ آپ ﷺ اپنی انگلیاں اس پانی میں ڈبوتے اور اپنے چہرے پر مل لیتے تھے‘ کبھی چادر اوڑھ لیتے اور کبھی اتار کر پھینک دیتے تھے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا بھی کرتے جاتے تھے: ((سُبحانَ اللّٰہ ، اِنّ لِلْمَوت سکرات)) ’’اے اللہ! تو پاک ہے‘ یقیناً موت کی سختی ہے‘‘۔ اسی درد کے عالَم میں جب آپ ﷺ کو آپ کی لختِ جگر حضرت فاطمہ ؓ نے دیکھا تو انہوں نے رونا شروع کر دیا اور کہا: وا کرب اباہ! ہائے میرے ابا جان کی تکلیف!‘‘ آپ ﷺ نے اشارہ کر کے فاطمہ ؓ کو پاس بلایا اور فرمایا کہ ’’بیٹی رومت! آج کے بعد تیرے والد کو کبھی کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔‘‘

یہ تو معاملہ ہے اُس ہستی کا جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ’’بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر‘‘۔ آپ کا اور میرا کیا حال ہوگا؟ ہمیں اللہ سے ڈرنا چاہیے اور دعا کرتے رہنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ آسانی فرمائے۔ اللہ تعالیٰ کا یہ کرم ہوتا ہے کہ نزع کے دوران انسان پر سکر کی کیفیت طاری کر دیتے ہیں۔ ’’سکر‘‘ کہتے ہیں نشہ کو۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿وَجَآءَتْ سَكْرَةُ الْمَوْتِ بِالْحَقِّ ؕ﴾ (قٓ: ۱۹)۔ اس بے ہوشی کے عالم میں ہی روح کو جسم سے جدا کر دیا جاتا ہے‘ جس کی وجہ سے درد کے احساس میں کمی آ جاتی ہے‘ ورنہ اگر ہوش کے دوران انسانوں کی روح قبض کی جاتی تو کسی نے ٹھیک کہا کہ مرنے والے کے لیے خصوصی ساؤنڈ

پروف کمرے تیار کیے جاتے اور جب یہ معلوم ہوتا کہ اب وفات کا وقت قریب ہے تو مرنے والے کو اس کمرے میں بند کر دیا جاتا اور پھر اس کی لاش وہاں سے برآمد کر لی جاتی۔

دوسری بات جو احوالِ موت کے سلسلے میں غور طلب ہے وہ یہ کہ وفات کے وقت فرماں بردار اور نافرمان کی کیفیت ہرگز برابر نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ نے سورۃ الجاثیہ میں فرمایا:

﴿اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ اجْتَرَحُوا السَّيِّاٰتِ اَنْ نَّجْعَلَهُمْ كَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ سَوَآءً مَّحْيَاهُمْ وَمَمَاتُهُمْ ؕ سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ﴿۲۱﴾﴾

’’کیا سمجھا ہے ان لوگوں نے جو کہ کماتے ہیں برائیاں‘ کہ ہم ان کو برابر کر دیں گے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور انہوں نے اچھے عمل کیے‘ برابر ہو جائے گا ان کا جینا اور ان کا مرنا؟ برے فیصلے ہیں جو وہ کر رہے ہیں۔‘‘

نافرمان کی موت انتہائی اذیت ناک ہوتی ہے۔ وہ جسمانی طور پر بھی درد سے دوچار ہوتا ہے اور ذہنی طور پر بھی اُسے بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ جسمانی سطح پر فرشتے جو اذیت دیتے ہیں اس کے متعلق سورۃ الانعام میں فرمایا:

﴿وَلَوْ تَرٰٓى اِذِ الظّٰلِمُوْنَ فِيْ غَمَرٰتِ الْمَوْتِ وَالْمَلٰٓئِكَةُ بَاسِطُوْٓا اَيْدِيْهِمْ ۚ اَخْرِجُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ؕ اَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ.....﴾ (آیت ۹۳)

’’کاش کہ تم ان ظالموں کو اُس وقت دیکھو جب کہ وہ موت کی سختیوں میں مبتلا ہوتے ہیں اور فرشتے ہاتھ بڑھا رہے ہوتے ہیں کہ نکالو اپنی جانیں! آج تم کو ذلت کے عذاب کی سزا دی جائے گی.....‘‘

سورۃ الانفال میں فرمایا:

﴿وَلَوْ تَرٰٓى اِذْ يَتَوَفَّى الَّذِيْنَ كَفَرُوا الْمَلٰٓئِكَةُ يَضْرِبُوْنَ وُجُوْهَهُمْ وَاَدْبَارَهُمْ ۚ وَذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ ﴿۵۰﴾﴾

’’اور کاش کہ تم اس وقت کی کیفیت کو دیکھو جب فرشتے کافروں کی جانیں نکالتے ہیں‘ ان کے مونہوں اور پیٹھوں پر مارتے ہیں کہ اب عذابِ آتش کا مزہ چکھو!‘‘

یہ تو کیفیت ہے جسمانی عذاب کی‘ لیکن اس سے آگے بڑھ کر جو ذہنی تکالیف کا سامنا ایک بدکردار کو موت کے وقت کرنا پڑتا ہے وہ اور زیادہ عبرت ناک ہے۔ یعنی جب وفات کے وقت اس کے درد کا عالَم یہ ہوتا ہے کہ بات کرنے کی سکت جاتی رہتی ہے تو دل ہی دل میں وہ اللہ تعالیٰ سے فریاد کر رہا ہوتا ہے۔ اس کا نقشہ سورۃ المؤمنون میں بایں الفاظ کھینچا گیا ہے:

﴿حَتّٰٓی اِذَا جَآءَ اَحَدَھُمُ الْمَوْتُ قَالَ رَبِّ ارْجِعُوْنِ ﴿۹۹﴾ لَعَلِّیْٓ اَعْمَلُ صَالِحًا فِیْمَا تَرَکْتُ﴾

''یہاں تک کہ ان میں سے جب کسی ایک پر موت آتی ہے تو فریاد کرتا ہے کہ اے میرے رب! مجھے لوٹا دے' تا کہ میں اچھا عمل کروں اس میں جو کچھ کہ میں چھوڑ کر مر رہا ہوں۔''

یعنی جو اولاد میرے پاس ہے اس کو تیرے دین کی خدمت میں لگا دوں اور جو مال تو نے مجھے عطا کیا ہے اس کو تیری راہ میں صدقہ وخیرات کر دوں۔ لیکن اللہ کا جواب کیا ہوتا ہے:

﴿کَلَّا ؕ اِنَّھَا کَلِمَۃٌ ھُوَ قَآئِلُھَا ؕ﴾

''ہرگز نہیں' یہ تو ایک بات ہے جو کہ وہ اس سے پہلے بھی کہا کرتا تھا۔''

یعنی اس سے پہلے بھی ہم نے کئی بار تمہیں جھنجھوڑنے کے لیے مصائب میں مبتلا کیا تھا' اور جب تم پر کوئی مصیبت آئی تو ہمارے سامنے گڑگڑایا اور فریاد کی' اور جب ہم نے تم سے اس تکلیف کو رفع کیا تو پھر تم نے ایسی شانِ بے نیازی کا مظاہرہ کیا کہ ہم کو بالکل بھول گیا اور جو وعدے تم نے ہم سے کیے تھے ان کو بھی فراموش کر بیٹھا۔

﴿وَمِنْ وَّرَآئِھِمْ بَرْزَخٌ اِلٰی یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ ﴿۱۰۰﴾﴾

''اور (اس کے بعد) ان کے پیچھے برزخ ہے اس دن تک کے لیے جس روز وہ دوبارہ اٹھائے جائیں گے۔''

سورۃ الزمر میں فرمایا:

﴿وَاتَّبِعُوْٓا اَحْسَنَ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکُمْ مِّنْ رَّبِّکُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ یَّاْتِیَکُمُ الْعَذَابُ بَغْتَۃً وَّاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ ﴿۵۵﴾﴾

''اور پیروی کرو بہترین طریقے پر اُس کی جو کہ تمہاری طرف نازل کیا گیا ہے تمہارے رب کی طرف سے اس سے پہلے کہ تم پر عذاب آجائے اچانک اور تمہیں معلوم تک نہ ہو۔''

یعنی ممکن ہے کہ تم اپنے گھر میں یا کام کاج میں مشغول ہو اور اچانک ہارٹ اٹیک ہو اور دل کی دھڑکن بند ہو جائے۔ یا یہ بھی ممکن ہے کہ تم بالکل صحیح سلامت اپنے گھر سے نکلو اور کوئی روڈ ایکسیڈنٹ ایسا ہو کہ جس میں تمہاری وفات ہو جائے۔

﴿اَنْ تَقُوْلَ نَفْسٌ یّٰحَسْرَتٰی عَلٰی مَا فَرَّطْتُّ فِیْ جَنْۢبِ اللّٰہِ وَاِنْ کُنْتُ لَمِنَ السّٰخِرِیْنَ ﴿۵۶﴾﴾

''کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی جان یہ کہنے لگے ہائے حسرت ہے اس کوتاہی پر جو کہ میں نے اللہ کی جناب میں کی اور میں تو مذاق اڑانے والوں میں شامل رہا۔''

یعنی میں کبھی سنجیدہ ہی نہیں ہوا۔ میں نے بارہا یہ سنا کہ اصل راحت' اصل عیش اور اصل گھر دارالآخرۃ ہے' اصل عزت بھی آخرت کی ہے اور اصل ذلت بھی وہیں کی ہے' دنیا میں یوں رہو جیسے کوئی اجنبی یا کوئی راہ چلتا مسافر' لیکن میں نے یہ سب غیر سنجیدہ ہو کر سنا۔

﴿اَوْ تَقُوْلَ لَوْ اَنَّ اللّٰہَ ھَدٰىنِیْ لَکُنْتُ مِنَ الْمُتَّقِیْنَ ﴿۵۷﴾﴾

''یا کہنے لگے کہ اگر اللہ نے مجھے ہدایت بخشی ہوتی تو میں بھی متقیوں میں سے ہوتا!''

یعنی میں بھی بچ بچ کر چلتا' میرے گھر میں بھی ستر وحجاب کے احکامات نافذ ہوتے' میرے گھر سے بھی ناچ گانے کی صدائیں بلند نہ ہوتیں' بلکہ میری ذات' میری اولاد' میرا گھرانہ اللہ کا فرماں بردار ہوتا۔

﴿اَوْ تَقُوْلَ حِیْنَ تَرَی الْعَذَابَ لَوْ اَنَّ لِیْ کَرَّۃً فَاَکُوْنَ مِنَ الْمُحْسِنِیْنَ ﴿۵۸﴾﴾

''یا (کہیں ایسا نہ ہو کہ) وہ کہنے لگے جب کہ وہ عذاب کو دیکھے اے کاش مجھے ایک موقع اور مل جائے تو میں محسنین میں سے ہو جاؤں گا۔''

عزیز قارئین' نوٹ کیجیے! اب یہ نہیں کہہ رہا کہ میں مسلم ہوں گا یا میں مؤمن ہوں گا' بلکہ کہتا ہے محسن ہو جاؤں گا۔ یعنی عبادت کا سب سے اعلیٰ درجہ اختیار کروں گا۔ اے اللہ! میں تیری عبادت ایسے کروں گا گویا تجھے دیکھ رہا ہوں۔ اللہ تعالیٰ کا جواب سنئے:

﴿بَلٰی قَدْ جَآءَتْکَ اٰیٰتِیْ فَکَذَّبْتَ بِھَا وَاسْتَکْبَرْتَ وَکُنْتَ مِنَ الْکٰفِرِیْنَ ﴿۵۹﴾﴾

''کیوں نہیں! تیرے پاس میری آیات آ چکی تھیں سو تو نے ان کو جھٹلایا اور تکبر کیا اور تو منکرین میں سے تھا۔''

یعنی جب اللہ تعالیٰ کی آیات سن لینے کے بعد تجھ میں کوئی تبدیلی نہیں آئی' وہ آیات جو اگر پہاڑ پر بھی نازل کی جاتیں تو وہ ریزہ ریزہ ہو جاتا' تو کیا یہ موت کی سختی تجھے درجۂ احسان پر پہنچا دے گی؟ نہیں' بلکہ اگر ہم اب تمہیں دنیا میں بھیج بھی دیں تو تم پھر سے وہی کرو گے جس سے تمہیں روکا گیا تھا۔ تجھے میرے کسی بندے نے اللہ کا کلام سنایا تھا اور آج کے دن سے متعلق بھی آگاہ کر دیا تھا' لیکن تو نے ان سب آیات سے صرفِ نظر کیا اور دنیا ہی کا طلب گار بنا رہا۔ تو دنیا میں ہی بڑا بنا رہا' تو نے چاہا کہ دنیا میں عزت ہونی چاہیے' لیکن تو یہ بھول گیا کہ اصل عزت آخرت

کی ہے۔تو نے چاہا کہ دنیا میں کوئی ذلت نہ ہو اور تو یہ بھول گیا کہ اصل ذلت بھی وہیں کی ہے۔

قرآن وحدیث میں موت کا تذکرہ بار بار اس لیے کیا گیا ہے کہ موت ایک انسان کی زندگی بھر کی محنت' جذبات' شوق ولگاؤ کو پل بھر میں صفر کر دیتی ہے' انسان کو اپنی انتہائی محبوب اشیاء سے جدا کر دیتی ہے' بیوی چھوٹ جاتی ہے' بچے جدا ہو جاتے ہیں' مال پرایا ہو جاتا ہے' گھر بھی یہیں رہ جاتا ہے' دوست' رشتہ دار اور احباب سب چھوٹ جاتے ہیں کہ جن کی محبت میں انسان دنیا میں اپنی ساری توانائیاں کھپا رہا ہوتا ہے۔

اب آخری بات یہ کہ فرماں بردار کی موت کے وقت کیا کیفیت ہوتی ہے۔حقیقت یہ ہے کہ جو کوئی بھی اللہ سے ملاقات کا امید وار ہوتا ہے تو وہ چاہتا ہے کہ اللہ سے ملاقات کا وقت آجائے۔سورۃ العنکبوت میں فرمایا:

﴿مَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ اللّٰهِ فَاِنَّ اَجَلَ اللّٰهِ لَاٰتٍ ؕ﴾ (آیت ۵)

''اور جو کوئی امید رکھتا ہے اللہ تعالیٰ سے ملاقات کی تو (اسے معلوم ہونا چاہیے کہ) اللہ تبارک وتعالیٰ کا مقرر کیا ہوا وقت یقیناً آنے والا ہے۔''

نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''جو کوئی اللہ تعالیٰ سے ملنا چاہتا ہے تو اللہ بھی اس سے ملنا چاہتا ہے اور جو اللہ تعالیٰ سے ملنا نہیں چاہتا تو اللہ بھی اس سے نہیں ملنا چاہتا۔''

عزیز قارئین! اللہ اور بندے کے درمیان پردہ ہے ہی کیا سوائے موت کے! کون مؤمن نہیں چاہے گا کہ یہ پردہ ہٹے اور اللہ سے ملاقات کا وقت قریب آئے۔اسی طرح سے جس کا نظریہ یہ ہو کہ ((اَلدُّنْيَا سِجْنُ الْمُؤْمِنِ)) ''دنیا مؤمن کے لیے تو قید خانہ ہے'' تو کون نہیں چاہے گا کہ اس قید خانہ سے رہائی ہو؟ موت کی سختی برحق ہے' لیکن بندۂ مومن نہ صرف وفات کے لیے تیار رہتا ہے' بلکہ وہ تو خوش ہوتا ہے جب اس پر وقت وفات آتا ہے۔ علامہ اقبال کہتے ہیں:

نشانِ مردِ مؤمن با تو گویم
چوں مرگ آید تبسم بر لبِ اوست!

''کیا میں تمہیں بتاؤں مردِ مؤمن کی علامت کیا ہے؟ جب اس پر وقتِ وفات آتا ہے تو اس کے چہرے پر تبسم ہوتا ہے۔''

نبی کریم ﷺ کی زبان پر آخری الفاظ جو اس دنیا فانی سے رخصت ہوتے وقت تھے وہ بھی یہی تھے کہ ((بَلِ الرَّفِيْقِ الْاَعْلٰى)) اے اللہ! تو ہی میرا رفیق اعلیٰ ہے' اے اللہ! تو ہی میرا

محبوب حقیقی ہے۔اِنّا للّٰہ واِنّا الیہ راجعون۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے: **الموت خیر الحافظة' الموت خیر الواعظة**

''یہ موت انسان کی سب سے بڑی محافظ بھی ہے اور یہ موت ہی انسان کے لیے سب سے بڑا واعظ بھی ہے''۔لیکن آج انسان اس بڑی حقیقت کو سننا بھی گوارا نہیں کرتا۔آج انسان موت کی حقیقت سے بے خبر ہے۔بقول شاعر ؎

کچھ اس کی خبر بھی ہے تجھ کو وہ سوزِ جہنم کیا ہو گا
جس آگ کا ایندھن انساں ہو اُس آگ کا عالَم کیا ہو گا

یہ گھنگھرو گلے کا بولے گا اور سانس کا ڈورہ ٹوٹے گا
جب روح کھچے گی رگ رگ سے اُس وقت کا عالَم کیا ہو گا

یہ حال ہے دنیا حاضر کا' دنیا میں کسی کا کوئی نہیں
اِس گھر کا جب یہ عالَم ہے اُس حشر کا عالَم کیا ہو گا

یہ جسم گواہی خود دے گا ہر حصہ بدن کا بولے گا
خاموش زباں ہو جائے گی اُس وقت کا عالَم کیا ہو گا

اک بار خطا گر ہو جائے سو بار ادب سے توبہ کر
اک اشک یہاں کا بہتر ہے واں گریۂ قلب سے کیا ہو گا

جس آگ کا ایندھن انسان ہو اُس آگ کا عالَم کیا ہو گا
کچھ اس کی خبر بھی ہے تجھ کو وہ سوزِ جہنم کیا ہو گا

اللہ عزوجل سے دعا ہے کہ ہم پر موت کی سختی دور فرمائے اور ہمیں نیک لوگوں کی صحبت عطا فرما کر اُنہی کے ساتھ وفات دے۔ **ربّنا وتوفّنا مع الابرار**۔آمین!

❁❁❁

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبویؐ آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور دعوت وتبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

دعوتِ ولیمہ: ایک جائزہ

حافظ محمد زاہد☆

لفظ ولیمہ‘ول م سے بنا ہے جس کا معنی ہے جمع ہونا۔ چونکہ میاں بیوی کے جمع ہونے یعنی شب زفاف کے بعد یہ دعوت کی جاتی ہے اس لیے اس دعوت کا نام بھی ولیمہ مشہور ہوگیا۔ اس کے علاوہ لفظ ولیمہ ہر خوشی کی دعوت کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ اہلِ عرب ہر خوشی کی دعوت کے لیے ولیمہ کا لفظ استعمال کرتے ہیں‘ البتہ لغت کے معروف ائمہ کا اس بات پر اتفاق ہے کہ جب مطلق طور پر ولیمہ کا لفظ بولا جائے تو اس سے مراد شادی کی دعوت ہی ہوتی ہے جسے ”طعام العروس“ بھی کہا جاتا ہے۔

یہاں یہ بات ذہن نشین کرنے کی ہے کہ کھانے کا انتظام چاہے شادی والے دن کیا جائے یا شب زفاف کے بعد اگلے دن‘ دونوں دعوتیں ولیمہ ہی شمار ہوں گی۔

ولیمہ کی شرعی حیثیت

ولیمہ واجب ہے یا سنت‘ اس میں فقہاء کا اختلاف ہے۔ امام مالکؒ کے نزدیک ولیمہ واجب ہے‘ جبکہ امام ابوحنیفہؒ اور اکثر فقہاء کی رائے یہ ہے کہ ولیمہ واجب نہیں‘ بلکہ سنت اور مستحب ہے— یہ اختلاف اپنی جگہ‘ مگر احادیث اور سنت رسول ﷺ میں ولیمہ کرنے کے بارے میں کافی تائید و تاکید نظر آتی ہے۔ مثلاً:

(۱) حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے شادی کی تو آپ ﷺ نے فرمایا: ((اَوْلِمْ وَلَوْ بِشَاۃٍ))(۱) ”ولیمہ کی دعوت کرو اگرچہ ایک بکری سے ہی کیوں نہ ہو۔“

(۲) نبی کریم ﷺ نے اپنی ہر شادی کے موقع پر دعوتِ ولیمہ کا انتظام فرمایا۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

مَا اَوْلَمَ النَّبِیُّ ﷺ عَلٰی شَیْئٍ مِنْ نِسَائِہٖ مَا اَوْلَمَ عَلٰی زَیْنَبَ اَوْلَمَ بِشَاۃٍ (۲)

”نبی کریم ﷺ نے حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے برابر اپنی کسی بیوی کا ولیمہ نہیں کیا‘ کیونکہ وہ ایک بکری کا ولیمہ تھا۔“

☆ ادارتی معاون‘ شعبہ مطبوعات‘ قرآن اکیڈمی‘ لاہور۔ 03214291904

دوسری روایت بھی حضرت انس رضی اللہ عنہ ہی سے مروی ہے‘ فرماتے ہیں:

اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ اَعْتَقَ صَفِیَّۃَ وَتَزَوَّجَھَا وَجَعَلَ عِتْقَھَا صَدَاقَھَا وَاَوْلَمَ عَلَیْھَا بِحَیْسٍ (۳)

”رسول اللہ ﷺ نے حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کو آزاد کیا اور آزادی ہی کو ان کا مہر بنا دیا اور ان کے ولیمہ میں مالیدہ کھلایا۔“

(۳) عہد نبویؐ میں ایسا کوئی نکاح دکھائی نہیں دیتا جس میں ولیمہ نہ کیا گیا ہو۔

(۴) ولیمہ اس لیے بھی ضروری ہے تاکہ شادی کا اعلان ہو جائے کہ فلاں مرد کی فلاں عورت سے شادی ہوگئی ہے۔

ان تمام باتوں سے اس طرف اشارہ ملتا ہے کہ ولیمہ کرنا ایک مسنون اور ضروری عمل ہے‘ اس لیے ہر شخص کو چاہیے کہ اپنی استطاعت کے مطابق ولیمہ لازمی کرے۔ یہاں یہ ذہن میں رہے کہ ولیمہ میں ضروری نہیں ہے کہ بہت خرچ کیا جائے‘ بلکہ ولیمہ ہونا چاہیے چاہے تھوڑی سی کھجوروں سے ہی کیوں نہ ہو۔

ولیمہ کا وقت

ولیمہ کی شرعی حیثیت کی طرح ولیمہ کے وقت کے بارے میں بھی فقہاء میں اختلاف پایا جاتا ہے اور دو طرح کی آراء سامنے آتی ہیں: (۱) ولیمہ کا انعقاد عقد نکاح کے وقت کیا جائے‘ اور (۲) ولیمہ شب زفاف گزارنے کے بعد منعقد کیا جائے۔ یہ دوسری رائے زیادہ بہتر معلوم ہوتی ہے‘ اس لیے کہ ولیمہ کے لفظی معنی بھی اسی طرف اشارہ کر رہے ہیں اور رسول اللہ ﷺ کا معمول بھی یہی تھا کہ آپؐ نے اپنی ہر شادی کے موقع پر شب زفاف کے بعد ولیمہ کیا۔ مگر یہ کوئی ضروری نہیں ہے‘ بلکہ میاں بیوی کی خلوت سے پہلے بھی ولیمہ کیا جا سکتا ہے۔ جیسے عرب ممالک میں شادی والے دن لڑکے اور لڑکی کے تمام احباب جمع ہو جاتے ہیں اور اسی دن دعوت کر دی جاتی ہے۔ یہ دعوت مرد کی طرف سے ہوتی ہے اور یہی ولیمہ شمار ہوتی ہے۔

ولیمہ کے وقت کے حوالے سے یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ شادی کے دو دن تک جو دعوت کی جاتی ہے وہ دعوتِ ولیمہ شمار ہوتی ہے‘ جبکہ دو دن کے بعد کی جانے والی دعوت ولیمہ نہیں بلکہ عام دعوت شمار ہوگی۔ فتاویٰ رحیمیہ میں مذکور ہے:

”دو روز تک کی دعوت کو دعوت ولیمہ کہتے ہیں اس کے بعد دعوت دینے کو دعوت ولیمہ

نہیں کہتے۔‘‘(۴)

دعوتِ ولیمہ میں غرباء کو شریک کرنے کا حکم

ولیمہ ایک خوشی کا موقع ہوتا ہے اس لیے اس موقع پر غرباء کو بھی اپنے ساتھ شامل کرنا چاہیے۔ رسول اللہ ﷺ نے ایسا ولیمہ جس میں غرباء کو نہ بلایا گیا ہو‘ برا کھانا قرار دیا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((شَرُّ الطَّعَامِ طَعَامُ الْوَلِيْمَةِ يُمْنَعُهَا مَنْ يَاْتِيْهَا وَيُدْعَى اِلَيْهَا مَنْ يَاْبَاهَا))(۵)

’’کھانوں میں سے برا کھانا اس دعوت ولیمہ کا ہے جس میں کھانے کے خواہش مندوں (غریبوں) کو نہ بلایا جائے اور کھانے سے انکار کرنے والوں (امیروں) کو بلا لیا جائے۔‘‘

ایک روایت میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا قول نقل ہوا ہے جس میں اس موضوع کو صراحتاً بیان کیا گیا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے:

شَرُّ الطَّعَامِ طَعَامُ الْوَلِيْمَةِ يُدْعَى لَهَا الْاَغْنِيَاءُ وَيُتْرَكُ الْفُقَرَاءُ(۶)

’’کھانوں میں سے برا کھانا اس دعوت ولیمہ کا ہے جس میں امیروں کو بلایا جائے اور غریبوں کو چھوڑ دیا جائے۔‘‘

ان روایات سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ غریبوں کو بھی شادی کی اس دعوت میں بلانا چاہیے‘ مگر ہمارے معاشرے میں ایسا نہیں کیا جاتا اور صرف امیروں کو بلایا جاتا ہے۔ مولانا اشرف علی تھانویؒ اس بارے میں افسوس کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

’’ولیمہ سنت ہے لیکن اس عارض کی وجہ سے برا ہو گیا ہے۔ افسوس آج کل اکثر ولیمے اسی قسم کے ہوتے ہیں جن میں محض برادری کے معززین کو بلایا جاتا ہے اور غرباء کو نہیں پوچھا جاتا ہے‘ بلکہ اس جگہ سے نکال دیا جاتا ہے‘ حالانکہ جن فقراء کو ولیمہ سے نکالا جاتا ہے ان کی نسبت رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: ((تُنْصَرُوْنَ وَتُرْزَقُوْنَ اِلَّا بِضُعَفَائِكُمْ)) ’’تمہاری جو مدد کی جاتی ہے اور تمہیں جو رزق دیا جاتا ہے وہ فقراء وضعفاء کی وجہ سے تو دیا جاتا ہے‘‘۔ پس نہایت بے حیائی ہے کہ جن کی وجہ سے رزق دیا گیا ہے انہیں اس رزق سے دھکّے دیے جائیں۔‘‘(۷)

دعوتِ ولیمہ قبول کرنے کا حکم

رسول اللہ ﷺ نے یہ حکم دیا ہے کہ اگر کوئی ولیمہ کی دعوت دے تو اس کی دعوت کو ضرور قبول کرنا چاہیے‘ اور اگر کسی نے نفلی روزہ رکھا ہے تو اس کو توڑ دے اور ولیمہ کی دعوت کو قبول

کرے۔ بلا وجہ دعوتِ ولیمہ کو ٹھکرانا سنتِ رسولؐ سے انحراف کے مترادف ہے۔ حضرت ابنِ عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے‘ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اِذَا دُعِيَ اَحَدُكُمْ اِلَى الْوَلِيْمَةِ فَلْيَاْتِهَا))(۸)

’’جب تم میں سے کسی کو ولیمہ کی طرف بلایا (یعنی دعوت دی) جائے تو وہ ضرور جائے۔‘‘

ایک روایت میں دعوتِ ولیمہ قبول نہ کرنے کو اللہ اور رسول کی نافرمانی قرار دیا گیا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((مَنْ لَمْ يُجِبِ الدَّعْوَةَ فَقَدْ عَصَى اللّٰهَ وَرَسُوْلَهُ))(۹)

’’جس نے دعوتِ ولیمہ قبول نہ کی اس نے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی نافرمانی کی۔‘‘

بعض صورتوں میں دعوتِ ولیمہ میں شرکت نہ کرنے کا حکم

ویسے تو ولیمہ میں شرکت کرنا مستحسن ہے‘ مگر بعض صورتوں میں ولیمہ میں شرکت نہ کرنے کی اجازت ہے‘ بلکہ حکم ہے کہ ایسے ولیمہ میں شرکت نہ کی جائے‘ مثلاً:

پہلی صورت: اگر دعوتِ ولیمہ کے موقع پر ڈھول باجے‘ گانے‘ فلم بنانے اور اس جیسے دیگر منکرات ہوں تو اس دعوت میں شرکت قطعی حرام ہے۔ سورۃ النساء میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَقَدْ نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ اَنْ اِذَا سَمِعْتُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ يُكْفَرُ بِهَا وَيُسْتَهْزَاُ بِهَا فَلَا تَقْعُدُوْا مَعَهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖٓ اِنَّكُمْ اِذًا مِّثْلُهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ جَامِعُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْكٰفِرِيْنَ فِيْ جَهَنَّمَ جَمِيْعَۨا ۝۱۴۰﴾

’’اور یہ بات وہ تم پر نازل کر چکا ہے اپنی کتاب میں کہ جب تم سنو کہ اللہ تعالیٰ کی آیات کے ساتھ کفر کیا جا رہا ہے اور مذاق اڑایا جا رہا ہے تو ان کے ساتھ نہ بیٹھو یہاں تک کہ وہ کسی اور بات میں لگ جائیں‘ ورنہ تم بھی انہی کی مانند ہو جاؤ گے۔ یقیناً اللہ تعالیٰ تمام منافقوں اور کافروں کو جمع کرنے والا ہے جہنم میں سب کے سب۔‘‘

دوسری صورت: اگر دعوتِ ولیمہ کے موقع پر حرام اور ناجائز اشیاء مثلاً شراب وغیرہ کا اہتمام کیا گیا ہو‘ یا معلوم ہو کہ صاحب دعوت کی کمائی حرام کی ہے تو اس دعوت میں شرکت کرنا بھی ممنوع ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد پاک ہے:

((مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَلَا يَجْلِسْ عَلٰى مَائِدَةٍ يُدَارُ عَلَيْهَا بِالْخَمْرِ))(۱۰)

’’جو شخص اللہ تعالیٰ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہے وہ ایسے دسترخوان پر نہ بیٹھے

جس پر شراب کا دور دورہ ہو۔''

تیسری صورت: ایسی دعوتِ ولیمہ میں بھی شرکت سے گریز کرنا چاہیے جہاں فخر و ریا کاری کے لیے کھانے کا انتظام کیا گیا ہو۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

اِنَّ النَّبِیَّ ﷺ نَھٰی عَنْ طَعَامِ الْمُتَبَارِیَیْنِ اَنْ یُّؤْکَلَ (۱۱)

''نبی کریم ﷺ نے ایسے لوگوں کے کھانے (کی دعوت میں شرکت) سے منع فرمایا جو (دعوت کا بندوبست) باہم فخر و ریا کاری کے لیے کرتے ہیں۔''

چوتھی صورت: جہاں جاندار چیزوں کو جمع کیا گیا ہو، مثلاً تصاویر وغیرہ ہوں وہاں بھی شرکت سے گریز کرنا چاہیے:

''حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ ایک گھر سے محض اس لیے واپس چلے گئے کہ وہاں تصاویر تھیں۔ اسی طرح یہ واقعہ بھی موجود ہے کہ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے ابو ایوب رضی اللہ عنہ کی دعوت کی۔ ابو ایوبؓ نے ان کے گھر میں تصویروں والا پردہ پڑا دیکھا (تو غصہ کا اظہار فرمایا)۔ ابن عمرؓ نے (معذرت کرتے ہوئے) کہا کہ اس مسئلہ میں عورتوں نے ہمیں مجبور کر دیا ہے۔ ابو ایوبؓ نے کہا: (کم از کم مجھے تم سے یہ امید نہ تھی اور) مجھے قسم ہے اللہ کی! میں تمہارے گھر کا کھانا نہیں کھاؤں گا۔ اور یہ کہہ کر چل دیے۔''(۱۲)

حواشی

(۱) صحیح البخاری، کتاب النکاح، باب الولیمة حق۔ اور متعدد مقامات۔
(۲) صحیح البخاری، کتاب النکاح، باب الولیمة ولو بشاة۔
(۳) ایضاً۔
(۴) فتاویٰ رحیمیہ، جلد ۳، ص ۱۲۶۔
(۵) صحیح مسلم، کتاب النکاح، باب الامر باجابة الداعی الی الدعوة۔
(۶) صحیح البخاری، کتاب النکاح، باب من ترك الدعوة فقد عصی اللّٰہ ورسولہ۔
(۷) اسلامی شادی، ص ۲۲۷۔
(۸) صحیح مسلم، کتاب النکاح، باب الامر باجابة الداعی الی دعوة۔
(۹) ایضاً۔
(۱۰) سنن الترمذی، کتاب الادب، باب ما جاء فی دخول الحمام۔ قال ابو عیسیٰ ھذا حدیثٌ حسنٌ غریبٌ۔
(۱۱) سنن ابی داؤد، کتاب الاطعمہ، باب فی طعام المتباریین۔
(۱۲) صحیح البخاری، کتاب النکاح، باب ھل یرجع اذا رأی منکرا فی الدعوة۔

ذوالقرنین‘ سدِّ ذوالقرنین اور --- یاجوج ماجوج

شاہین عطر جنجوعہ

قرآن پاک کی سورۃ الکہف میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنْ ذِي الْقَرْنَيْنِ ۭ ......﴾

’’اور تم سے یہ ذوالقرنین کے بارے میں پوچھتے ہیں۔‘‘

آیت کی ابتدا ’’يَسْئَلُوْنَكَ‘‘ سے کر کے اللہ تعالیٰ یہ بتا رہے ہیں کہ حضور ﷺ سے ذوالقرنین کے بارے میں پوچھا گیا تھا۔ روایات اس بات کی تصدیق کرتی ہیں کہ ذوالقرنین کا قصہ مشرکینِ مکّہ کے پوچھنے پر بیان کیا گیا تھا۔ مزید برآں مشرکین مکہ کو اصلاً مدینہ کے یہودیوں نے اُکسایا تھا کہ تم محمد (ﷺ) سے فلاں تین سوالات کرو: (۱) اصحابِ کہف کا قصّہ کیا تھا؟ (۲) ذوالقرنین کون تھے؟ اور (۳) روح کیا ہے؟

ان سوالات کا جواب سورۂ بنی اسرائیل اور سورۃ الکہف میں دیا گیا ہے۔ فی الوقت ہمارا موضوع ذوالقرنین ہیں۔ قرآن نے جو تفصیلات ذوالقرنین کی بتائی ہیں ان سے چند تاریخی واقعات اور چند اصول کی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ یہاں پر سورۃ الکہف کا وہ حصہ نقل کر دینا خالی از فائدہ نہ ہوگا جو ذوالقرنین سے متعلق ہے۔ ہماری آگے کی بحث اسی حصے کو سامنے رکھتے ہوئے چلے گی۔

☆ ’’بحث و نظر‘‘ کے عنوان سے شائع شدہ مضامین کے مندرجات سے ادارۂ میثاق کا اتفاق ضروری نہیں۔ وضاحت طلب امور کے لیے صاحب مضمون سے رابطہ کیا جا سکتا ہے:
(فون:03345080530)

﴿وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنْ ذِي الْقَرْنَيْنِ ۭ قُلْ سَاَتْلُوْا عَلَيْكُمْ مِّنْهُ ذِكْرًا ۭ﴿٨٣﴾ اِنَّا مَكَّنَّا لَهٗ فِي
الْاَرْضِ وَاٰتَيْنٰهُ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ سَبَبًا ۙ﴿٨٤﴾ فَاَتْبَعَ سَبَبًا ﴿٨٥﴾ حَتّٰٓى اِذَا بَلَغَ مَغْرِبَ
الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَغْرُبُ فِيْ عَيْنٍ حَمِئَةٍ وَّوَجَدَ عِنْدَهَا قَوْمًا ڛ قُلْنَا يٰذَا
الْقَرْنَيْنِ اِمَّآ اَنْ تُعَذِّبَ وَاِمَّآ اَنْ تَتَّخِذَ فِيْهِمْ حُسْنًا ﴿٨٦﴾ قَالَ اَمَّا مَنْ ظَلَمَ
فَسَوْفَ نُعَذِّبُهٗ ثُمَّ يُرَدُّ اِلٰى رَبِّهٖ فَيُعَذِّبُهٗ عَذَابًا نُّكْرًا ﴿٨٧﴾ وَاَمَّا مَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ
صَالِحًا فَلَهٗ جَزَاۗءَ ۨالْحُسْنٰى ۚ وَسَنَقُوْلُ لَهٗ مِنْ اَمْرِنَا يُسْرًا ۭ﴿٨٨﴾ ثُمَّ اَتْبَعَ سَبَبًا ﴿٨٩﴾
حَتّٰٓى اِذَا بَلَغَ مَطْلِعَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَطْلُعُ عَلٰي قَوْمٍ لَّمْ نَجْعَلْ لَّهُمْ مِّنْ
دُوْنِهَا سِتْرًا ۙ﴿٩٠﴾ كَذٰلِكَ ۭ وَقَدْ اَحَطْنَا بِمَا لَدَيْهِ خُبْرًا ﴿٩١﴾ ثُمَّ اَتْبَعَ سَبَبًا ﴿٩٢﴾ حَتّٰٓى
اِذَا بَلَغَ بَيْنَ السَّدَّيْنِ وَجَدَ مِنْ دُوْنِهِمَا قَوْمًا ۙ لَّا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ قَوْلًا ﴿٩٣﴾
قَالُوْا يٰذَا الْقَرْنَيْنِ اِنَّ يَاْجُوْجَ وَمَاْجُوْجَ مُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ فَهَلْ نَجْعَلُ
لَكَ خَرْجًا عَلٰٓي اَنْ تَجْعَلَ بَيْنَنَا وَبَيْنَهُمْ سَدًّا ﴿٩٤﴾ قَالَ مَا مَكَّنِّيْ فِيْهِ رَبِّيْ خَيْرٌ
فَاَعِيْنُوْنِيْ بِقُوَّةٍ اَجْعَلْ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ رَدْمًا ۙ﴿٩٥﴾ اٰتُوْنِيْ زُبَرَ الْحَدِيْدِ ۭ حَتّٰٓى اِذَا
سَاوٰى بَيْنَ الصَّدَفَيْنِ قَالَ انْفُخُوْا ۭ حَتّٰٓى اِذَا جَعَلَهٗ نَارًا ۙ قَالَ اٰتُوْنِيْٓ اُفْرِغْ
عَلَيْهِ قِطْرًا ۭ﴿٩٦﴾ فَمَا اسْطَاعُوْٓا اَنْ يَّظْهَرُوْهُ وَمَا اسْتَطَاعُوْا لَهٗ نَقْبًا ﴿٩٧﴾ قَالَ هٰذَا
رَحْمَةٌ مِّنْ رَّبِّيْ ۚ فَاِذَا جَاۗءَ وَعْدُ رَبِّيْ جَعَلَهٗ دَكَّاۗءَ ۚ وَكَانَ وَعْدُ رَبِّيْ حَقًّا ۭ﴿٩٨﴾

نزولِ قرآن کے بعد سے اب تک کی تاریخ اسلام میں مختلف تفاسیر میں مختلف تاریخی شخصیات کو قرآن میں بیان کردہ ذوالقرنین کے مماثل بیان کیا گیا ہے۔ یعنی ذوالقرنین کے بارے میں مختلف آراء عالمِ اسلام کے مفکّرین میں پائی جاتی ہیں۔ ایک قدیم تفسیری رائے کے مطابق مقدونیہ کا سکندرِ اعظم ذوالقرنین ہے‘ کیونکہ اس کی فتوحات مشرق و مغرب میں پھیلیں اور اس کی سلطنت بہت وسیع تھی لیکن مولانا ابوالکلام آزاد‘ مولانا مودودی اور مولانا امین احسن اصلاحی رحمہم اللہ نے ان تفاصیل کی بنیاد پر جو قرآن میں بیان کی گئی ہیں‘ ایران کے بادشاہ کیخورس‘ جو فارس کی سلطنت کا بانی تھا‘ کو ذوالقرنین کے مماثل ٹھہرایا ہے۔ ان حضرات میں سے مولانا ابوالکلام آزادؒ نے سب سے پہلے اس رائے کا اظہار کیا تھا۔

اس قصے میں دوسری بحث یاجوج و ماجوج کے بارے میں ہے۔ اس بارے میں مولانا ابوالکلام آزادؒ کی رائے یہ ہے کہ زمین کے شمالی نصف کُرّے یعنی سائبیریا، رشیا اور وسطی ایشیا کے علاقے میں جو قومیں آباد تھیں ان کے دو گروہ یاجوج و ماجوج ہیں۔ ان لوگوں کا وہ حصہ جو اس علاقے میں سالہا سال تک آباد رہا اور اُس نے اپنی وحشت اور بربریت، لوٹ مار والی طرزِ زندگی کو جاری رکھا، وہ ایک قوم ''یاجوج'' کہلا سکتی ہے۔ مولانا آزادؒ نے یاجوج کا لفظ نہیں کہا لیکن ان کی رائے میں دونوں الفاظ میں سے کوئی ایک لفظ ان پر چسپاں کیا جا سکتا ہے اور میں آسانی کے لیے پہلا یعنی ''یاجوج'' استعمال کر رہا ہوں۔ دوسری طرف ان ہی لوگوں میں سے کچھ گروہ تاریخ کے مختلف ادوار میں دور دراز مغرب کو نقل مکانی کر کے مشرقی اور مغربی یورپ کے مختلف علاقوں میں آباد ہوتے رہے۔ وہ اپنی قدیم وحشیانہ طرزِ زندگی کو آہستہ آہستہ ترک کر کے متمدن اور مہذب ہوتے چلے گئے، یہاں تک کہ ان میں قدیم طرزِ زندگی کا کوئی شائبہ نہ رہا اور وہ ترقی یافتہ شہری زندگی گزارنے لگے۔ یہ لوگ اپنے آباء و اَجداد سے بالکل مختلف ہو گئے۔ ان لوگوں کو دوسرا گروہ کہا جا سکتا ہے۔ میں قارئین کی آسانی کے لیے اس گروہ کے لیے ''ماجوج'' کا لفظ استعمال کر سکتا ہوں۔ یہی ترقی یافتہ لوگ اتنے جدید ہو گئے کہ پھیل کر پوری دنیا پر قابض ہو گئے اور اپنی تمدنی اور تہذیبی خصوصیات کو پوری دنیا میں رواج دے دیا۔ اس تمدنی تاریخ کو وہ چار اہم ادوار میں تقسیم کرتے ہیں۔ اسلامی اور دیگر متمدّن علاقوں پر ہلاکو خان کے حملے کو وہ یاجوج و ماجوج کا آخری خروج سمجھتے ہیں۔ ابوالکلام کی رائے کے مطابق ہلاکو خان، یاجوج و ماجوج کی نسل کا فرد تھا۔

مولانا مودودیؒ کی رائے میں سیتھین اور ہن نسلیں، جن کی ذرّیت میں سے ہی منگول قوم ہے، یاجوج و ماجوج ہیں، کیونکہ یہ نسلیں قدیم زمانے سے متمدن علاقوں پر حملے کرتی رہی ہیں۔ ان کے خیال میں خورس فارسی نے ان کی یلغاروں کو روکنے کے لیے دربند اور داریال (دو درّے ہیں) کے استحکامات تعمیر کیے تھے۔ یہ ایک طرح سے ذوالقرنین کی ''سد'' تھی جو اُس نے یاجوج و ماجوج کو روکنے کے لیے تعمیر کی۔

مولانا ابوالکلام کے بقول خورس کو ''ذوالقرنین'' اس لیے کہا جاتا تھا کہ اس کے ماتھے پر بالوں کی دو لٹیں لٹکتی رہتی تھیں۔ مولانا مودودیؒ کی رائے میں دانیال نبی نے جو خواب دیکھا تھا اس میں میدیا (Media) اور فارس (پارتھیا) کی سلطنت کو مینڈھے کے دو سینگوں کی شکل میں اُبھرتے دیکھا تھا جو خورس نے فتح کر لیے تھے۔ نیز نقشے پر بھی یہ مشترکہ سلطنت ایک

مینڈھے کی شکل میں نظر آتی ہے۔ اس لیے کیخورس ذوالقرنین کہلانے لگا۔ یہ وہی کیخورس تھا جس نے اشوری سلطنت، جو عراق میں قائم تھی، پر حملہ کیا اور اسے برباد کیا۔ پھر یہود جو اشوریوں کے غلام تھے، ان کو وطن واپس جانے اور ہیکل تعمیر کرنے کی اجازت دی اور مدد فرمائی۔ اس لیے یہودی اس کو پسند کرتے تھے اور اس کو یاد رکھا ہوا تھا۔

مولانا انور شاہ کشمیریؒ نے یاجوج ماجوج کے ہر بلندی سے پھسلنے کے حوالے سے طویل بحث کی ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ قرآن میں واضح فیصلہ ہے کہ کوئی تباہ شدہ قوم اس وقت تک پلٹ نہیں سکتی جب تک یاجوج ماجوج ہر حدب سے پھسل کر نہیں گرنے لگتے۔ اب تاریخ میں دیکھا جائے تو یہ ایک حقیقت ہے کہ حضور ﷺ ایک دین لے کر آئے جو انہوں نے پہلے عربوں کو پہنچایا پھر باقی دنیا کو۔ عیسائیوں خاص کر مشرقی رومی عیسائیوں نے اس ہدایت کو قبول نہیں کیا اور جس گمراہی میں وہ پڑے تھے اسلام کو رد کر کے انہوں نے اسی گمراہی میں رہنا قبول کر لیا۔ وہ دنیا میں ایک بے ضرر اور ناکارہ قوم رہ گئے۔ ایک اور تاریخی نکتہ یہ ہے کہ یوحنا کی انجیل میں ایک مکاشفے کی رو سے شیطان کو ایک ہزار سال کے لیے قید کر لیا گیا تھا۔ (حضور ﷺ کی بعثت ۶۱۰ء لی جائے اور) حضور ﷺ کے زمانے سے آگے ایک ہزار سال شمار کریں تو وہ سولہویں سترھویں صدی تک جاتا ہے۔ اُس وقت یورپی قومیں اپنے خواب اور کاہلی سے بیدار ہو گئیں اور اپنے ممالک سے نکل کھڑی ہوئیں۔ یہ تباہ حال قوم کا پلٹنا تھا۔ گویا یاجوج ماجوج نکل کھڑے ہوئے اور وہ اپنے ساتھ تباہی، بربادی، بے دین، بے اصول اور دنیا پرستی کی تہذیب لے کر آئے۔ مختصراً یہ کہ مولانا انور شاہ کشمیری کی رائے میں جرمنی، برطانیہ اور فرانس وغیرہ اقوام یاجوج ماجوج تھیں جو تقریباً ''ہزار'' سال ''قید'' یا ''غفلت'' میں رہیں۔ پھر جب ''شیطان'' کھلا تو گویا یاجوج ماجوج بھی کھل گئے۔

لیکن جیسا کہ ان آراء کے پیش کرنے والوں نے بھی تسلیم کیا ہے کہ یہ تصویر قرآن کی پیش کردہ تفصیلات پر کلیتاً منطبق نہیں ہوتی۔ اسی طرح اور لوگوں کے بارے میں تو میں کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن کم از کم اپنے بارے میں، میں یہ ضرور کہتا ہوں کہ اس جواب یا آراء سے جو قبل ازیں ذکر کیے گئے ہیں، میری اپنی ذہنی تشفی بھی پوری طرح نہیں ہو رہی تھی۔

ان تمام آراء میں ایک بات واضح ہے کہ جب قرآنی قصے میں مذکور ''شخصیت'' کو کسی تاریخی شخصیت پر چسپاں کیا جاتا ہے تو دیگر واقعات والا حصہ چوکھٹے سے باہر نکل جاتا ہے، یعنی ایک مسئلے کا حل نظر آتا ہے تو دوسری طرف کوئی خلا رہ جاتا ہے، اور دوسرے کسی رخ کی سمجھ آتی

معلوم ہوتی ہے تو پہلا سرا ہاتھ سے نکل جاتا ہے۔

مثلاً مولانا مودودیؒ نے خورس کی مشرق اور مغرب کی سمت میں کی جانے والی مہمات کا ذکر کیا ہے اور اس کے عدل کی شہرت کی بھی معلومات دی ہیں' لیکن انہوں نے یہ بات تسلیم کی ہے کہ تاریخ میں خورس کی کسی تیسری مہم کا تذکرہ نہیں ملتا۔ لہٰذا یہاں پر یاجوج ماجوج کو روکنے والی لوہے سے تعمیر کردہ دیوار کے بارے میں خلجان رہ جاتا ہے۔ دوسری طرف مولانا ابوالکلام کی رائے کے مطابق سیتھین اور ہُن نسلوں میں سے آنے والے منگولوں اور ہلاکو خان کے حملے کو ان کا دیوار توڑ کر آنا سمجھا جائے یعنی ہر بلندی سے یاجوج ماجوج کا اترنا' تو اول تو انہوں نے کوئی لوہے کی دیوار توڑ کر اپنی تاخت وتاراج کی ابتدا یا توسیع نہیں کی' کیونکہ ان کے حملے کے وقت کا تاریخی ریکارڈ بحفظ صحت واقعات محفوظ ہے اور پھر اس واقعے کو ہوئے عرصہ گزر چکا ہے' تو ان کے بلندی سے اترنے سے پہلے کسی علاقے میں محصور ومحدود رہنے اور نکل جانے کے بعد کسی قوم کے پلٹ آنے والے واقعے کی توجیہہ نہیں ہو پاتی۔ میری مراد ہے معلوم تاریخی حالات کے تجزیے کے بعد کوئی قوم اس واقعے کا مصداق نہیں ملتی جو پلٹی ہو۔

ایک رائے علامہ اقبالؒ کی بھی ہے۔ اپنی نجی گفتگو میں پروفیسر یوسف سلیم چشتیؒ کے یاجوج ماجوج کے بارے میں سوال کا جواب یہ دیا کہ یہ عربی کے الفاظ نہیں ہیں بلکہ سمیری زبان کے الفاظ ''گوگ میٹ گوگ'' کا معرب ہے۔ سمیری زبان میں گوگ میٹ گوگ' ہاری اور جاگیردار کو کہا جا سکتا ہے۔ گویا جدید اصطلاح میں سرمایہ دار اور مزدور۔ یعنی اقبال کے نزدیک یاجوج اور ماجوج اشارہ تھا زمیندار اور مزدور کی آپس کی کشمکش کا جو جدید دور میں سرمایہ دار اور مزدور کی کشاکش بن گیا۔

سرمایہ دار اور مزدور کی کشمکش اور اس کا یاجوج ماجوج سے تعلق علامہ اقبال کی ایک نظم سے بھی آشکار ہوتا ہے۔ جب روس میں انقلاب آیا یعنی کمیونسٹ انقلاب جو سرمایہ داری کے مخالف ایک نظام تھا اور اسی سال بالفور ڈیکلریشن کے ذریعے یہودیوں کو ایک وطن بنا کر دینے کا وعدہ کیا گیا تو اس پر اقبال نے چند اشعار کہے۔

محنت و سرمایہ دنیا میں صف آرا ہو گئے — دیکھئے ہوتا ہے کس کس کی تمناؤں کا خون
حکمت و تدبیر سے یہ فتنہ آشوب خیز — ٹل نہیں سکتا ''وَقَدْ كُنْتُمْ بِهٖ تَسْتَعْجِلُوْنَ''
کھل گئے یاجوج اور ماجوج کے لشکر تمام — چشمِ مسلم دیکھ لے تفسیر حرفِ ''يَنْسِلُوْنَ''

اس نظم سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ سرمایہ دار اور مزدور کی جنگ کو یاجوج ماجوج کی جنگ سمجھتے تھے اور اسے سورۃ الانبیاء کی آیت ﴿حَتّٰٓى اِذَا فُتِحَتْ يَاْجُوْجُ وَمَاْجُوْجُ وَهُمْ مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ يَّنْسِلُوْنَ ۝۹۶﴾ کی عملی تفسیر سمجھتے تھے' لیکن یہاں بھی ایک مسئلہ پیدا ہوتا ہے کہ تاریخ میں وہ شخصیت جس نے اس فساد سے بچنے کے لیے کوئی دیوار تعمیر کی وہ کون تھی؟ کہاں تھی؟ اس کو ان کے فساد سے کیا نقصان ہوتا تھا؟ ان سوالات کے جوابات نامعلوم رہ جاتے ہیں۔

مولانا انور شاہ کی رائے کا معاملہ بھی یہی ہے کہ یاجوج ماجوج یعنی مغربی اقوام ہر بلندی سے اتر کر پوری دنیا پر چھائے' لیکن یہ واقعہ سولہویں سترہویں صدی میں ہو گیا تھا۔ کون سی تباہ شدہ قوم پلٹی؟ کب پلٹی؟ پھر دیوار والا حصہ اور ذوالقرنین کی مشرق ومغرب کی مہمات والا حصہ بھی غیر حل شدہ رہ گیا ہے۔

یہ ہیں کچھ کمیاں اور حل طلب نکات جن کی وجہ سے متذکرہ بالا علماء کی آراء مسئلے کا مکمل حل نہیں کر پا رہی ہیں۔ اسی وجہ سے مجھے بھی ذاتی طور پر ان تفاسیر سے مکمل تشفی اور تسلی نہیں ہو رہی تھی۔ چنانچہ میں اپنی تحقیق اور غور وفکر سے چند نتائج پر پہنچا ہوں۔

متذکرہ بالا آراء سے مجھے کم از کم ایک فائدہ تو ہوا کہ میں نے اپنی تحقیق کے بارے میں یہ فیصلہ کیا کہ مجھے قصے کو سمجھنے کے لیے سخت لفظی تعبیر کی تلاش کے بجائے قصے کو تاریخ میں زمانے پر پھیلے ہوئے واقعات کے مطابق کرنے کی کوشش کرنا چاہیے۔ تاریخی حقائق' قوتوں اور عروج وزوال کے بنیادی رجحانات اور محرکات کو نظر میں رکھنا چاہیے۔

خورس یا کیخسرو کو بطور ذوالقرنین تسلیم کرنے میں مجھے جن وجوہات سے تامل ہے' وہ یہ ہیں:

(۱) اگر خورس یا کیخسرو کے ماتھے پر دو لٹیں بالوں کی لٹکتی رہتی تھیں جس کی وجہ سے وہ ''ذوالقرنین'' مشہور تھا تو میرے خیال میں یہ کوئی ایسا وصف نہیں جو فقط ایک انسان میں ممکن ہو اور وہ اس کی وجہ سے مشہور ہو سکے۔ بالوں کی دو لٹیں ہزاروں انسانوں میں ہو سکتی ہیں۔ لہٰذا مولانا ابوالکلامؒ کی اس رائے سے مجھے اتفاق نہیں ہو پا رہا۔

(۲) اگر بقول مولانا مودودی' کیخورس یا خسرو کو ذوالقرنین اس لیے کہا جاتا تھا کہ اس نے فارس اور میدیا کی سلطنتوں کو متحد کیا تھا اور بائبل میں دانیال نبی کے جس خواب کا تذکرہ ہے' اس میں مینڈھے کے دو سینگوں کو دیکھا گیا تھا جو گویا خورس کی سلطنت یا خورس کے لیے ایک تمثیلی پیرایہ تھا' لہٰذا خورس ہی ذوالقرنین ہے' کیونکہ اس کی مشرق اور مغرب کی سمتوں کی مہمات بھی معلوم ومعروف ہیں۔ لیکن مجھے مطالعے سے پتا چلا ہے کہ اس خواب میں دیکھا گیا

کہ پہلے مینڈھے کا ایک سینگ بڑھا اور بڑھتا ہی چلا گیا' پھر دو سینگ ابھرے اور پھر بڑھتے ہی چلے گئے' لہٰذا یہ خواب تو فقط خورس یا اس کی سلطنت کے لیے تمثیل معلوم نہیں ہوتا بلکہ یہودیوں کے لیے کچھ اور معنویت رکھتا ہے۔

(۳) تیسری بات یہ کہ ہمارے اکثر اکابر نے شمالی قطع کے ہُن' سیتھین اور منگول لوگوں کو وحشی سمجھ رکھا ہے۔ کیا دنیا میں دیگر کوئی قوم وحشی نہیں ہے؟ کیا عربوں میں قتل و غارت گری اور لوٹ مار نہیں ہوتی تھی؟ کیا قبائل ایک دوسرے سے مسلسل انتقامی جنگ میں برسرِ پیکار نہیں رہتے تھے؟ قدیم عراق پر بھی عیلامی' عموری' اکادی اور نہ جانے کون کون سی قومیں حملہ نہیں کرتی رہیں؟ کیا اشوریوں نے اسرائیلیوں کو تباہ نہیں کیا؟ فقط ''مسک''، ''توبل'' اور ''رش'' کے ٹھنڈ کے مارے خانہ بدوش وحشی ہو گئے اور باقی تمام انسانیت مہذب اور صلح پسند! اس بات کا کوئی جواز اور ثبوت نہیں کہ ہُن' سیتھین اور منگولوں ہی کو وحشی' یاجوج ماجوج اور تہذیب اور دین سے لاپروا کہا جائے۔ کیا منگولوں نے بھی اسلام قبول نہیں کیا؟ کیا عرب سارے کے سارے اسلام لے آئے؟ کیا آج کی مغربی اقوام کی علمی بلندی اور آگہی ان کے ماتھے سے نام نہاد ہُن' سیتھین اور علاوی ''وحشی'' ہونے کے دھبے کو مٹا نہیں دیتی؟ جو شے مغرب سے آئے یاجوج ماجوج اور ''حرام'' کہلائے اور مشرق کی ہر شے ''شَرَاباً طَھُوْرًا'' ٹھہرے۔ اس کی کوئی منطق نہیں۔

(۴) سب سے دشوار معاملہ ذوالقرنین کی تعمیر کردہ لوہے اور قطر (تانبے) کی دیوار کا ہے۔ اول تو لوہے کی کوئی دیوار بن جائے تو زنگ لگنے کے باوجود صدیوں تک باقی رہ سکتی ہے اور اگر دیوار باقی نہ بھی رہے تو کچھ نہ کچھ نشانات و آثار ضرور باقی رہ سکتے ہیں۔ آج بھی بابل اور نینوا سے تین اور چار ہزار سال پرانی گیلی مٹی کو دھوپ میں پکا کر بنائی گئی اینٹیں دریافت ہو رہی ہیں جن پر اس دور کی کندہ شدہ تحریریں باقی ہیں۔ اس پر خود اندازہ کیجیے لوہے اور تانبے کی بنی دیوار کی ''زندگی'' کا عرصہ کتنا دراز ہو سکتا ہے؟ نشان تو مل ہی سکتا ہے۔ جب مسلمانوں نے ساتویں اور آٹھویں صدی عیسوی میں خراسان اور قفقاز کے علاقے فتح کیے' اس وقت تو کسی ''خورس'' کی تعمیر کردہ ''ایک ہزار سال پرانی'' دیوار یا کم از کم اُس کے آثار تو مل جاتے۔ اگر کوئی دیوار تھی' جیسا کہ گھروں کی یا قلعوں یا شہروں کی حفاظتی دیواریں ہوتی ہیں تو وہ کتنی اونچی تھی؟ دو' چار یا چھ فٹ؟ دو پہاڑوں کے درمیان تعمیر ہوئی تو کتنی لمبی تھی؟ ہزار' دو ہزار یا تین ہزار میٹر؟ کبھی ہم نے سوچا کہ اتنی لمبی اور اتنی اونچی دیوار جو کسی وحشی گروہ کو محدود کر دے' اتنی آسانی سے تعمیر ہو سکتی ہے اتنے پرانے کسی زمانے میں؟ اگر ہو ہی گئی جسے نہ توڑا جا سکتا تھا نہ عبور کیا جا سکتا

تھا تو کیا یاجوج ماجوج یعنی ہُن اور سیتھین لوگوں کو اتنی عقل اور ہمت نہ تھی کہ لمبا راستہ کاٹ کر گھوم پھر کر پہاڑ یا دیوار یا دونوں کو دائیں بائیں چھوڑتے ہوئے نکل آتے اور حملہ کر دیتے؟ تاریخ ایسی مثالوں سے بھری پڑی ہے جہاں حملہ آور نے دشمن پر سامنے سے حملہ کرنے کے بجائے' جبکہ کوئی رکاوٹ بھی نہ تھی' انتہائی لمبا اور مشکل راستہ طے کر کے دشمن پر پشت سے حملہ کیا۔ مثلاً قیصر روم نے کسریٰ ایران سے بدلہ لینے کے لیے لمبا چکر کاٹ کر ایران پر شمال مشرق سے حملہ کیا نہ کہ سامنے کے ایشیائے کوچک کے علاقوں سے۔ حضور ﷺ نے چھ ہجری میں مکہ کے قریب پہنچ کر عام راستے سے ہٹ کر لمبا چکر کاٹ کر ایک دم حدیبیہ میں نزول کیا۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ لوہے کی ''دیوار'' کسی سمجھ دار جرنیل اور قائد کی طرف سے کوئی ایسی کامیاب حکمت عملی نہ ہوتی جس سے دشمن کو عرصے تک روکا جا سکتا اور نہ مخالف اتنا بے وقوف کہ اس کے پاس اس رکاوٹ سے نکلنے کا کوئی راستہ نہ ہو۔ پھر یہ کہ اگر ہوتی تو فوراً منہدم تو نہیں کی جا سکتی تھی لہٰذا اس کا نشان ضرور ملنا چاہیے۔ اور اگرچہ مولانا مودودی کہتے ہیں کہ ذوالقرنین نے دربند اور داریال کے استحکامات تعمیر کیے تھے' اگرچہ قطعی ثبوت نہیں' پھر بھی میرے خیال میں قابل قبول نہیں۔ کیونکہ قرآن نے لوہے اور تانبے کی دیوار کا ذکر کیا ہے' لہٰذا وہ استحکامات جس نے بھی تعمیر کیے ان میں لوہا اور تانبا ضرور ملنا چاہیے تھا اور یہ واقعہ ضرور مشہور ہونا چاہیے تھا' جبکہ ایسی کوئی شے نہ تاریخی ریکارڈ میں ہے اور نہ دریافت ہوئی ہے۔

(۵) پھر یہ کہ ضروری نہیں کہ یہود نے یہ سوال اس لیے کیا ہو کہ ان کی اپنی تاریخ میں یہ معلوم اور معروف تھا۔ میرے اس خیال کی تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ اگر ان کی تاریخ میں یہ بات معلوم و معروف ہوتی تو جو یہودی اسلام لائے وہ اس قصے کو بڑی شرح و بسط کے ساتھ سمجھا دیتے اور یہ مسئلہ اسلام کے قرنِ اوّل ہی میں حل ہو جاتا' جو نہیں ہوا۔ انتہائی عالم و فاضل یہودی اکابر مثلاً عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ بھی اسلام لے آئے تھے' لیکن ہمیں ان کی طرف سے اس قصے کی کوئی توضیح نہیں ملتی۔ تو جیسے بعض طلبہ استاد کو لاجواب کرنے کے لیے یا بعض ضدی یا ہٹ دھرم لوگ کسی کو لاجواب کرنے کے لیے موضوع بحث و مطالعہ سے دور سے یا غیر متعلق سوال پوچھتے ہیں' ایسے ہی یہودیوں نے اپنے ہاں مستعمل ''ذوالقرنین'' لیکن خود ان کو نامعلوم لفظ ''ذوالقرنین'' کا مطلب حضور ﷺ سے پوچھ لیا۔ ظاہر ہے انہوں نے یہ سوال جذبہ استعلام سے تو پوچھا نہیں تھا۔ ان کا خود اس بارے میں لاعلم ہونا اچنبھے کی بات نہیں۔

اصحابِ کہف کا قصہ بھی یہودیوں کا قصہ نہیں بلکہ مولانا مودودی کی تحقیق کے مطابق اس قصے کو شام کے ایک پادری کے مرتب کردہ واعظوں کے مجموعے میں دریافت کیا گیا ہے۔ یہ قصہ تو کتب مقدسہ میں موجود ہی نہیں' تو یہودیوں نے کیسے پوچھ لیا؟ اصحاب کہف والے سوال سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ یہودی ادھر ادھر کے ''مذہبی قصے'' پوچھتے اور اپنی دانست میں حضور ﷺ کو لاجواب کرنے کی کوشش کرتے۔ لہٰذا میرے نزدیک یہ قصہ بھی یہودیوں کی اپنی تاریخ کا نہیں بلکہ ادھر ادھر کی ''سنی سنائی'' کا ''رعب'' تھا۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ بھی صحیح نہیں' وہ بھی صحیح نہیں تو پھر حقیقت ہے کیا؟ میں اپنی تحقیق سے جس نتیجے اور حل پر پہنچا ہوں' آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔

(جاری ہے)

ہماری ویب سائٹ

www.tanzeem.org

پر ملاحظہ کیجیے:

- ☆ تنظیم اسلامی کا تعارف
- ☆ بانیٔ تنظیم اسلامی محترم ڈاکٹر اسرار احمد کا مکمل دورۂ ترجمۂ قرآن
- ☆ بانیٔ تنظیم اسلامی اور امیر تنظیم اسلامی کے مختلف خطابات
- ☆ تلاوتِ قرآن' دروسِ قرآن' دروسِ حدیث اور خطاباتِ جمعہ
- ☆ صحیح بخاری' صحیح مسلم' موطا امام مالک اور اربعین نوویؒ کے تراجم
- ☆ میثاق' حکمت قرآن اور ندائے خلافت کے تازہ اور سابقہ شمارے
- ☆ اردو اور انگریزی کتابیں
- ☆ آڈیو/ویڈیو کیسٹس' سی ڈیز اور مطبوعات کی مکمل فہرست

Sep. 2014
Regd. CPL No. 115
vol. 63
No. 9

Monthly Meesaq Lahore

رسولِ اکرم ﷺ کی عظمت، آپؐ کے مقصدِ بعثت، اسوۂ رسول ﷺ کے قرآنی تصور، سیرتِ نبوی ﷺ کے مختلف گوشوں، خاص طور پر آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے انقلابی پہلو جیسے علمی و عملی موضوعات پر 9 کتابوں کا مجموعہ

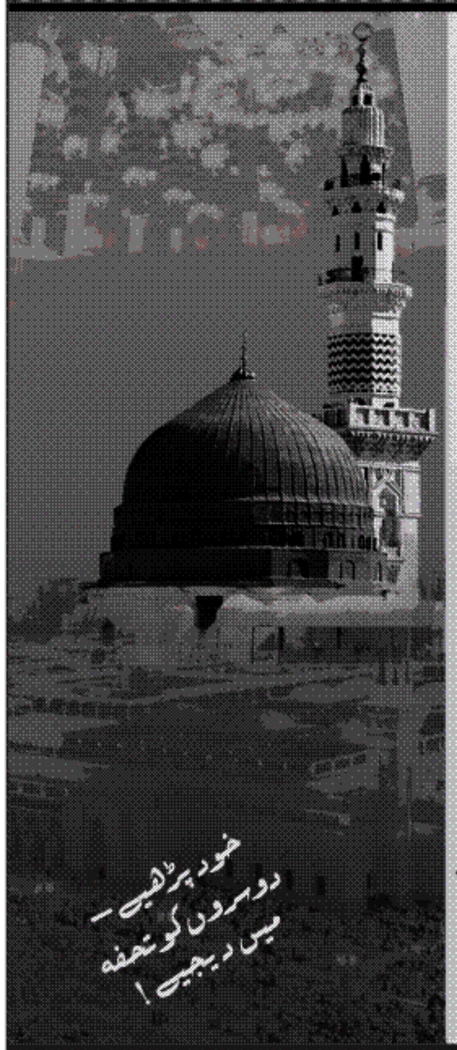

رسولِ اکرم ﷺ اور ہم

از ڈاکٹر اسرار احمدؒ

دیدہ زیب ٹائٹل کے ساتھ

516 صفحات پر مشتمل فکر انگیز تالیف

اشاعت خاص (مجلد):
امپورٹڈ آفسٹ پیپر، قیمت: 450 روپے

اشاعت عام (پیپر بیک):
امپورٹڈ بک پیپر، قیمت: 300 روپے

خود پڑھیں۔ دوسروں کو تحفہ میں دیجیے!

مکتبہ خدام القرآن لاہور

36۔ کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور فون: 042-35869501-3

maktaba@tanzeem.org

داخلے جاری ہیں

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور
کے زیر اہتمام

(پارٹ I اور II)

رجوع الی القرآن کورسز

بانی کورس ڈاکٹر اسرار احمدؒ

یہ کورسز بنیادی طور پر تعلیم یافتہ افراد کے لیے ترتیب دیے گئے ہیں' تاکہ وہ حضرات جو کم از کم انٹرمیڈیٹ کی سطح تک اپنی دنیاوی تعلیم مکمل کر چکے ہوں اور اب بنیادی دینی تعلیم بالخصوص عربی زبان سیکھ کر فہم قرآن کے حصول کے خواہش مند ہوں' ان کو رسز کے ذریعے ان کو ایک ٹھوس بنیاد فراہم کر دی جائے۔ ہفتے میں پانچ دن روزانہ صبح کے اوقات میں تقریباً پانچ گھنٹے تدریس ہوگی۔ ہفتہ وار تعطیل ہفتہ اور اتوار کو ہوگی۔

نصاب (پارٹ I)

1. عربی صرف ونحو
2. ترجمۂ قرآن
3. آیاتِ قرآنی کی صرفی ونحوی تحلیل
4. قرآن حکیم کی فکری وعملی راہنمائی
5. تجوید و ناظرہ
6. مطالعۂ حدیث و فقہ العبادات
7. اصطلاحاتِ حدیث
8. اضافی محاضرات

نصاب (پارٹ II)

1. مکمل ترجمۃ القرآن (مع تفسیری توضیحات)
2. مجموعۂ حدیث
3. فقہ
4. اصولِ تفسیر
5. اصولِ حدیث
6. اصولِ فقہ
7. عقیدہ
8. عربی زبان وادب
9. اضافی محاضرات

نوٹ:

- کلاسز کا آغاز یکم ستمبر سے ہو رہا ہے
- خواہش مند خواتین وحضرات داخلہ کے لیے رابطہ کر سکتے ہیں
- پارٹ II میں خواتین کی شرکت کا انتظام نہیں ہے

داخلہ کے خواہشمند یکم ستمبر تک اپنی رجسٹریشن ضرور کروالیں۔ رجسٹریشن نہ ہونے کی صورت میں لیٹ داخلہ نہیں دیا جائے گا۔

پارٹ I میں داخلے کے لیے انٹرمیڈیٹ پاس ہونا اور پارٹ II میں داخلے کے لیے رجوع الی القرآن کورس (پارٹ I) پاس کرنا لازمی ہے

برائے رابطہ: قرآن اکیڈمی

36-K ماڈل ٹاؤن لاہور
فون: 35869501-3
email:irts@tanzeem. org

ندیم سہیل
0322-4371473